ایک نیم مردہ بچے کی تین سگی ماؤں
کی کہانی، وہ مائیں اس بچے کی سلامتی
کے لیے اپنی اپنی ممتا کو سوتیلی ماؤں
کی طرح کچل رہی تھیں۔

بانو دوکان کے اندر کھلونوں اور کتابوں کو ترتیب سے رکھ رہی تھی اس کی ماں دکان
کے باہر رحمانی سیل کا بورڈ لگا رہی تھی۔ بورڈ پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔

"صرف ایک روپے میں آپ اپنی پسند کی کوئی بھی چیز خرید سکتے ہیں۔"

لوگ آرہے تھے اور اپنی پسند کی چیزیں خرید رہے تھے ایک بری فوج کا کیپٹن ٹہلتا
ہوا وہاں پہنچ گیا۔ فوج کی وردی میں وہ بہت ہی اسمارٹ نظر آرہا تھا۔ اس نے بانو کی بوڑھی
ماں سے کہا۔

"ماں جی۔ یہ جنگ کا زمانہ ہے فوجی گاڑیاں یہاں سے کسی وقت بھی گزر سکتی ہیں اور
آپ نے دکان کا سامان یہاں راستے تک پھیلا دیا ہے۔ پلیز یہ سامان اپنی دکان تک محدود
رکھیں۔"

ایسا کہتے وقت اس کی نظریں بھٹکتی ہوئی دکان کے اندر گئیں۔ پھر بانو پر ٹھہر گئیں۔
وہ گلابی رنگ کے لباس میں گلابی گلابی سی لگ رہی تھی۔ آفیسر سے نظریں ملتے ہی وہ گلابی
سے سرخی مائل ہو گئی۔ اجنبی نگاہوں کی دھوپ رنگ حسن کا مزاج بدل دیتی ہے۔ اس
کی ماں آفیسر سے معذرت چاہ رہی تھی اور وعدہ کر رہی تھی کہ وہ جلد ہی تمام سامان راستے
سے ہٹا لے گی آفیسر نے مسکرا کر کہا۔

"ماں جی! کوئی بات نہیں۔ جب فوجی گاڑیوں کے گزرنے کا وقت آئے گا تو میں
آپ کو بتا دوں گا۔ ابھی آپ اطمینان سے دکانداری کریں۔"

"او آفیسر تم کتنے اچھے ہو۔ کتنے مہربان ہو۔ آؤ میری دکان سے کوئی چیز پسند کرو۔"
اس نے دور بانو کی طرف نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

"بے شک پسند کروں گا لیکن قیمت ادا کروں گا۔ میں رشوت پسند نہیں کرتا کیونکہ
میں خدا سے ڈرتا ہوں۔"

بوڑھی عورت نے حیرانی سے پوچھا۔

"او آفیسر! کیا تم مسلمان ہو؟"

"الحمد للہ۔ لیکن آپ کو حیرانی کیوں ہے؟"

"اس لئے کہ تم ہندوستانی فوج کے سپاہی ہو۔"

اس نے ہنستے ہوئے کہا "تو کیا ہوا۔ ہماری سینا میں مسلمان سپاہی بھی ہوتے ہیں۔
یہ دیش ہم سب کا ہے۔"

وہ مسکراتا ہوا دکان کے شوکیس کے پاس آگیا۔ بانو ایک گاہک سے نمٹ رہی تھی۔
جب وہ چلا گیا تو اس نے کیپٹن سے پوچھا "فرمائیے۔"

اس نے دکان کے باہر بورڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس بورڈ پر لکھا ہوا ہے کہ ایک روپے میں کوئی بھی چیز خریدی جا سکتی ہے۔" اس نے
بانو کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔ "کیا کوئی بھی چیز؟"

"جی ہاں۔ کوئی بھی..." وہ کہتے کہتے چونک گئی۔ کیپٹن اسے مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔
پھر اس نے جیب سے ایک روپیہ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

بانو کو میٹھا میٹھا خطرہ محسوس ہوا۔ اس کی امی اسے نصیحتیں کرتی رہتی تھیں کہ وہ
مردوں کی بے تکلفی اور چکنی چپڑی باتوں سے خود کو بچا کر رکھے۔ ایک بار وہ فریب کھا چکی ہے
اب اسی فریب کے آئینے میں اجنبی مردوں کا چہرہ دیکھنا چاہئے۔ لہٰذا بانو نے اس ایک روپیہ کو
قبول کرنے کے بجائے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"آپ یہ تو بتائیے خریدنا کیا چاہتے ہیں؟"

"سب سے حسین چیز..... اگرچہ یہ انمول ہے دنیا کے سارے دولت مند اس کی
قیمت ادا نہیں کر سکتے۔ یہ ایک روپیہ تو میں اس دکان کے اصول کے مطابق دے رہا ہوں۔"

بانو کا دھڑکتا ہوا دل کہنے لگا "واقعی یہ مرد چکنی چپڑی باتیں کرتے ہیں۔ ایک
بات کے پیچھے اپنے مطلب کی دوسری بات کہہ جاتے ہیں۔ آفیسر کی اس بے باکی پر مجھے غصہ آ

انتظار کرنا چاہیے بیٹے۔ مگر میرا دل کیوں دھڑک رہا ہے؟

اس نے ایک دم سے گھبرا کر ماں کو آواز دی۔ ماں تیزی سے چلتی ہوئی آئی۔ "کیا بات ہے بانو؟"

بانو کے بولنے سے پہلے کیپٹن نے کہا۔

"میں آپ کی بیٹی کو پریشان کر رہا ہوں۔ یہاں سے کچھ خریدنا چاہتا ہوں۔"

بانو اس کی بے باکی پر چونک گئی تھی۔ ماں نے محبت سے جھڑکتے ہوئے کہا۔

"بیٹی تم پریشان کیوں ہو گئیں؟ آفیسر جو مانگتے ہیں وہ دے دو۔"

"ہم۔ مگر امی مجھے ان کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ آپ پوچھ لیں یہ کیا چاہتے ہیں؟"

وہ بانو ذرا ہٹ کر دکان کے دوسرے حصے میں چلی گئی پھر خود کو دوسرے کاموں میں لگا کر اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ مگر کان اس کی آواز پر لگے ہوئے تھے وہ کہہ رہا تھا۔

"ماں جی! کیا میں آپ کو امی کہہ سکتا ہوں؟"

ماں کی باچھیں کھل گئیں۔ "ضرور کہو میرے بیٹے! تمہارے ماں باپ کہاں ہیں؟"

"میرا کوئی نہیں ہے میں اتنی بڑی دنیا میں بالکل۔ تنہا۔۔۔"

اتنا کہتے کہتے اس کا لہجہ شیشے کی طرح ٹوٹ گیا۔ ماں کے دل سے آہ نکلی۔

بانو کے دل نے کہا۔ "بیچارہ۔"

بے چینی اور درد کے گئے تھے اسی طرح ہمدردی بنتے ہیں پہلے کسی اجنبی دل کے خلا میں جھانک کر دیکھا جاتا ہے پھر محبت اس دل کے خالی گوشے میں اپنی آواز پکار دیتی ہے۔

ایسا سوچتے ہی بانو چونک گئی۔ ہائے رے۔ میں کیا سوچ رہی ہوں۔ کوئی اس دنیا میں تنہا ہے۔ توجہ اور ہمدردی کا مستحق ہے تو ہوا کرے میرے دل نے جو زخم کھائے ہیں ان کے لئے اب میرے پاس آنسوؤں کا مرہم بھی نہیں ہے میں بہتے بہتے تھک گئی ہوں۔ اب میں کوئی نیا روگ نہیں لگاؤں گی۔ اب اس کی باتیں نہیں سنوں گی۔

وہ نگاہیں چرا سکتی تھی۔ منہ پھیر سکتی تھی مگر اپنے کان بند نہیں کر سکتی تھی وہ کہہ رہا تھا۔

"امی! آپ کی صورت ہو بہو میری امی جیسی ہے۔ بالکل ویسا ہی ممتا کا روپ ہے آپ کو دیکھتے ہی بے اختیار امی کہنے کو جی چاہنے لگا۔"

ماں نے بڑے پیار سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "آج سے میں تمہاری امی ہوں۔ دکان کے اندر آؤ۔ میں تمہیں دودھ پتی کی چائے پلاؤں گی۔"

وہ دکان کے اندر تو گیا۔ دل کے اندر جا کر بیٹھنا چاہتا تھا۔ اس نے بانو کو چور نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"امی ابھی میں ڈیوٹی پر ہوں۔ شام کو فرصت ہو گی۔ میں آپ کو بتا دوں کہ آج میری پیدائش کا دن ہے میں مایوس تھا کہ تنہا کس طرح سالگرہ مناؤں لیکن اب آپ کی ممتا نے تنہائی کا دکھ سمیٹ لیا ہے میں آپ کو اور آپ کی صاحبزادی کو۔ میرا مطلب ہے آپ گھر والوں کو دعوت میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آج رات آپ میرے ساتھ لنگر ہوٹل چلیں گی؟"

"نہیں بیٹے۔ یہ تکلف نہ کرو۔ میں تمہیں فضول خرچی کی اجازت نہیں دوں گی۔"

"آپ بڑی خوبصورتی سے میری دعوت کو ٹھکرا رہی ہیں۔"

"تم غلط سمجھ رہے ہو۔ ماں اپنے بچوں کا دل کبھی نہیں توڑتی۔ میں اپنے گھر میں سالگرہ کا اہتمام کروں گی شام کو چھٹی ہوتے ہی یہاں چلے آنا۔ میرا گھر یہاں سے دور نہیں ہے۔"

"اوہ امی! یہ تو گریٹ ہے۔ اتنے برسوں کے بعد میں ایک گھر میں باقاعدہ سالگرہ مناؤں گا۔ یہ خوشیاں مجھے آپ ہی کے دم سے مل رہی ہیں۔"

بانو نے ذرا سر گھما کر اسے دیکھا۔ اتنے بڑے آفیسر کے چہرے پر بچوں جیسی خوشیاں دیکھ کر وہ بے اختیار مسکرانے لگی۔ کیپٹن نے اچانک اس کی طرف دیکھا تو وہ جھینپ گئی۔ فوراً ہی سر جھکا کر بے کام کے کام میں مصروف ہو گئی۔

کیپٹن کے دل نے کہا "وہ مارا۔"

بانو کے دل نے کہا "ہائے میں مر گئی۔ کہیں وہ میری مسکراہٹ کا مطلب غلط نہ سمجھ بیٹھے۔ پھر کیا ہوگا؟"

وہ واپس جا رہا تھا۔ ماں نے پوچھا "بیٹے تم کوئی چیز خریدنے آئے تھے خالی ہاتھ کیوں جا رہے ہو؟"

اس نے پلٹ کر بانو کو دیکھا، پھر ماں کو دیکھ کر کہا۔

"میں نے خیال سے انمول چیز خریدی ہے اور وہ ہے محبت۔۔۔۔"

بانو کا دل دھک سے رہ گیا جیسے محبت کے ایک لفظ نے دھکا مارا ہو۔ جوانی کی شاہراہ پر جذبوں کا آنا جانا ہجوم ہو تو کہیں نہ کہیں سے ضرور دھکا لگتا ہے اور دھکا مارنے والے بڑی لاپرواہی سے گزر جاتے ہیں۔ بانو نے ذرا سنبھل کر دیکھا تو وہ جا چکا تھا۔

اس کی ماں بظاہر چپ چاپ کھڑی اوجھل ہونے والے سپاہی بیٹے کو دیکھ رہی تھی لیکن اس کی نظریں دائیں طرف ایک آئینے پر بھی تھیں جس میں بانو دکھائی دے رہی تھی وہ سوچ رہی تھی اور الجھ رہی تھی بیٹی کو الجھتے دیکھ کر ماں کے احساسات سلگنے لگے۔ جوانی کی ایسی کڑی دھوپ میں لڑکیاں محبت کی چھاؤں تلاش کرتی ہیں اور بانو محبت کی چھاؤں میں جل گئی تھی۔ ماں فکر مند ہو گئی کہ اب کیا ہوگا۔ بیٹی پہاڑ جیسی جوانی کیسے گزارے گی؟ کیا ہمیشہ شادی کے خیال سے سہم جایا کرے گی؟

وہ زیادہ دیر تک نہ سوچ سکی۔ آتے جاتے ہوئے گاہکوں نے اس کا دھیان بیٹی کی طرف سے ہٹا دیا۔ شام ہوتے ہی بلیک آؤٹ کی وجہ سے دکانیں بند ہو جاتی تھیں اس لئے ماں بیٹی بھی دکان بڑھانے لگیں۔ ماں نے کہا۔

"وہ ابھی تک نہیں آیا۔ میں بھی عجیب ہوں۔ اسے بیٹا بنایا مگر اس کا نام پوچھنا بھول گئی۔ تم نے پوچھا تھا بانو؟"

"وہ آں، نہیں تو، میں بھلا کیوں کسی کا نام پوچھوں؟"

"وہ ایسا نہ کہو بیٹی۔ سب ہی مرزا آصف کی طرح نہیں ہوتے یہ لڑکا اچھا ہے پھر بالکل اکیلا ہے۔ اسے ہماری محبت ملے گی تو یہ کبھی ساتھ نہیں چھوڑے گا۔"

"امی ہم دکاندار ہیں۔ یہاں گاہک جانے کے لئے آتے ہیں اور وہ آ کر جا چکا ہے اب آپ دکان بڑھائیں۔"

"نہیں بانو! میں کچھ دیر اس کا انتظار کروں گی تم گھر جا کر سالن اور بریانی تیار کرو۔ میں برتھ ڈے کیک لے آؤں گی۔"

وہ دل ہی دل میں بڑبڑاتی ہوئی زینے سے باہر نکل آئی باہر رعایتی سیل کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اس نے سوچا۔ "امی کا بس نہیں چلا ورنہ مجھے بھی رعایتی نرخ پر کسی کے ساتھ چلتا کر دیتیں۔ یہ بھی کوئی بات ہے دو گھڑی کی جان پہچان میں دعوت کا انتظام کر رہی ہیں اس کی سالگرہ منانے والی ہیں۔"

ماں پچھلے دو برس سے کسی بھی خوبرو اور کماؤ پوت شریف زادے کو ایسی نظروں سے دیکھتی آ رہی تھی جیسے وہ اس کی بانو کے لئے پیدا کیا گیا ہو۔ لیکن ہندوستان میں مسلمان لڑکے کہاں رہ گئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ سب پاکستان چلے گئے ہیں۔ کسی نے نہیں سوچا کہ بانو جوان ہوگی تو اس کا کیا بنے گا؟ اسی لئے جب کوئی مسلمان لڑکا جوہے سے نظر آ جاتا تو ماں اس پر واری صدقے ہونے لگتی تھی۔

بانو راستے کے کنارے ٹھٹھک گئی۔ وہ فوجی وردی میں ملبوس چند قدم کے فاصلے پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ سپاہی جانتا ہے کہ مورچہ کہاں بنانا چاہیئے۔ اس نے بانو کو شرماتے گھبراتے دیکھ کر کہا۔

"تمہاری سہمی ہوئی، جھجکی ہوئی اور شرماتی ہوئی ادائیں بتا رہی ہیں کہ تم کنواری اور اچھوتی ہو۔ اور مجھ سے پہلے کسی نے تمہارا راستہ نہیں روکا ہے۔"

بانو کو یوں لگا جیسے سپاہی اپنی بندوق کی گولی سے اس کے سینے کو داغ رہا ہے

وہ جلدی سے بولی ۔

،، امی نے آپ کے انتظار میں دکان ابھی تک بند نہیں کی ۔ آپ کو فوراً وہاں جانا چاہیئے

،، میں جان بوجھ کر دکان کی طرف نہیں گیا ۔ میں نے سوچا دعوت کے سلسلے میں کچھ بتانے کیلئے تمہاری امی گھر جائیں گی تو دکان میں اگر تم سے دل کی بات کہوں گا مگر وہ دکان میں رہ گئیں اور تم شاید گھر جا رہی ہو چلو یوں بھی کام چل رہا ہے ۔ تم ناراض تو نہیں ہو ؟

،، وہ ناراض کیوں ہوتی ؟ اسے تو اپنی قدر و قیمت کا اندازہ ہو رہا تھا وہ راستے کے کنارے یوں اٹھلا رہی تھی جیسے اپنی تقدیر کا راستہ دیکھ رہا ہو ۔ جیسے اپنی وردی پر اسے تمغے کی طرح سجا رہا ہو بھلا کوئی لڑکی ناراض نہیں ہوتی ۔ صرف رسماً اعتراض کرتی ہے

،، آپ کو ایسی باتیں نہیں کرنی چاہیئں ۔

،، میں نے آج تک کسی لڑکی سے دل کی بات نہیں کی ۔ میں نہیں جانتا کیسے کہنا چاہیئے کس طرح ابتداء کرنی چاہیئے ۔ عام سا طریقہ یہ ہے کہ اجنبیت دور کرنے کے لئے پہلے اپنا تعارف کرایا جاتا ہے تمہارا نام تو مجھے معلوم ہو چکا ہے ۔ ایران میں کنواری لڑکیوں کو بانو کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے ۔

پھر وہی کنوارپن کی بات اس نے کہہ دی ۔ بانو نے تیزی سے قدم آگے بڑھائیے ۔ تاکہ اس سے آگے نکل جائے ۔

،، بھئی اتنی تیزی سے نہ چلو ۔ کیا مجھے اپنے ساتھ چلنے کا حق نہیں دو گی ؟ کم از کم میرا نام تو پوچھ لو کبھی کام آئے گا ۔

،، دراصل آپ کا نام پوچھنا بھول گئی تھی ۔ آپ انہیں بتا دیں ۔

،، میرا نام نہیں بتاؤں گا ۔ پھر وہ تمہیں جانیں گی ؟ پھر تم اپنے دل کو بتاؤ گی پھر تمہارا دل اپنی دھڑکنوں کو بتائے گا ۔ کسی کا نام تھانے کچہری میں بھی آتا نہیں گھومتا پھرتا

تم کہنا چاہتی ہو ۔

بانو کو بے اختیار ہنسی آگئی ۔ وہ اپنی سنجیدگی برقرار نہ رکھ سکی ۔ اپنے ہنستے کھلکھلاتے ہونٹوں کو ہتھیلی کی آڑ میں چھپا کر بولی ۔

،، آپ بہت زیادہ بولتے ہیں ۔

،، ابتدائی مرحلے پر لڑکیاں شرماتی ہیں ۔ اس لئے خود بولنا چاہیئے اس کے بعد وہ بولنے کا موقع نہیں دیتیں ۔

،، آپ کو لڑکیوں کی دوستی کا خاصا تجربہ ہے ۔

،، ہاں میں نے دو بار قسمت آزمائی کی مگر قسمت میرے صبر کو آزماتی رہی ۔ پہلی بار میں نے محبت کی مگر وہ میری ہم مزاج نہیں تھی ۔ اس لئے میں نے اسے چھوڑ دیا ۔ دوسری بار لڑکی میرے معیار کے مطابق تھی مگر اس نے مجھے چھوڑ دیا ۔ اس نے بانو کو دیکھتے ہوئے کہا ۔ ،، پتہ نہیں تیسری بار کیا ہوگا ۔

بانو نے دھڑکتے ہوئے دل سے کہا ۔ ،، بار بار دھوکا کھانے سے بہتر ہے کہ کسی سے خالص محبت کی توقع نہ کی جائے ۔

،، یہ کیسے ہو سکتا ہے ،، کیپٹن نے کہا ۔ ،، ہم ٹریننگ کے جو مرحلے گزرتے ہیں یہ جانتے ہوئے بھی کہ کبھی نہ کبھی حادثہ پیش آئے گا ہم راستوں پر چلنا چھوڑ تو نہیں دیتے ۔ ہم جانتے ہیں کہ ایک انسان دوسرے انسان کو محبت کا فریب دیتا ہے پھر بھی ہم کسی نہ کسی سے محبت کئے بغیر نہیں رہ سکتے ۔ یہ نہ ہو تو دنیا میں گولے بارود اور فوجی وردی کے سوا کچھ نہ رہے ۔

بانو کے دل نے تائید کی ۔ ،، ہاں محبت کے بغیر ہر خوشی کھوکھلی سی لگتی ہے کسی کو پیار سے کچھ دیئے اور کچھ لئے بغیر رہا نہیں جاتا ۔ اسی لئے محبت ہماری زندگی میں موت کی طرح اٹل ہے ضرور آتی ہے اور بڑی خوبصورتی سے طاری رہتی ہے ۔

وہ محبت کے مارے اندر ہی اندر مرنے لگی۔ اس کے دل نے کہا۔ یہ آفیسر کیسے
اور بولے۔ کیوں کر اپنا نام ہی بتائے۔ نام نہیں بتائے گا تو پھر کس نام سے خیالوں میں آئے گا
"آپ پیچھا کرتے کرتے کتنی دور آگئے ہیں۔ اب آپ کو امی کے پاس جانا چاہیے۔"
"میں جاؤں گا اور انہیں اپنا نام بھی بتا دوں گا کہ میرا نام سرتاج حسین ہے مگر تم
چاہو تو سرتاج کہہ سکتی ہو۔"

"سرتاج۔ یہ لفظ تو بڑا ہی محبت پرور اور پائیدار ہوتا ہے عورت کا محافظ
ہوتا ہے اس کی عزت و آبرو اور مستقبل کا ضامن ہوتا ہے مگر یہ لفظ پان کی پیک کی
طرح ہونٹوں کے منہ پر پڑا اور دل کے لہو میں گھل گیا۔ اسے آصف یاد آیا جو سرتاج بن کر آیا تھا
اور سر کی چادر نوچ کر لے گیا تھا۔ وہ کیپٹن سرتاج حسین سے دور بھاگتی چلی گئی۔ اچھا ہوا
کہ گھر سامنے آ گیا تھا۔ وہ مکان میں گھستے ہی دروازہ بند کر کے دیکھنے والے کی نظروں سے
چھپ گئی۔

سرتاج حسین دو دکان تھوڑی دیر تک بند دروازے کو دیکھتا رہا اور یہ سوچ کر
مسکرایا کہ اس نے اپنے نام سے فائدہ اٹھا کر سرتاج والی بات خوب کہی ہے شادی
اور سرتاج کے ذکر پر کون کنواری نہیں شرماتی۔ اسی لئے وہ شرما کر بھاگ گئی۔ انسان کبھی کبھی
خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ مسکراتا ہوا دکان کی طرف واپس چلا گیا۔

بند دروازے کے پیچھے کنواری ایسے مرد کے خیال سے کانپتی رہی جو شوہر بن کر آتا ہے
اور سہاگ کے نام پر سب کچھ لوٹ کر چلا جاتا ہے اس کے پاؤں کانپ رہے تھے۔ سر چکرا رہا تھا
کوئی اور وقت ہوتا تو وہ چولہے کے پاس بیٹھ جاتی۔ بستر پر جا کر گر پڑتی اور خوب پھوٹ
پھوٹ کر رونا شروع کر دیتی لیکن ماں نے آج رات پھر ایک مہمان کے لئے دسترخوان بچھانے
کا فیصلہ کیا تھا۔ شرافت کے دائرے میں ... جوان بیٹیوں کو اسی طرح نگاہوں کے سامنے
بچھایا جاتا ہے وہ ماں کے سر سے اپنا بوجھ ہلکا کرنے کیلئے باورچی خانے میں چلی جانے لگی۔

جیسے خود کو چولہے میں جھونکنے جا رہی ہو۔

*

گمشدہ طیارے کے پائلٹ سے رابطہ قائم ہو چکا تھا۔ کنٹرول ٹاور کے ریڈیو آپریٹر
نے آخری بار اس سے کال کی۔ پھر بے بس ہو کر اس نے ٹیلیفون کا ریسیور اٹھایا اور ٹریفک
کنٹرول سینٹر کے نمبر ڈائل کرنے کے بعد کہا۔

"ہیلو! میں کنٹرول ٹاور سے ریڈیو آپریٹر بول رہا ہوں۔ فلائنگ کلب کے
چار نشستوں والے طیارے ایف سی ون ٹو۔ او۔ فور کا پائلٹ خاموش ہے بار بار کال کرنے کے
باوجود جواب نہیں مل رہا ہے اس طیارے کو فوراً تلاش کیا جائے۔"

دوسری طرف سے کنٹرول سینٹر کے کیپٹن نے پوچھا۔

"اس طیارے سے آخری بار کب رابطہ ہوا تھا؟"

"صبح ساڑھے نو بجے اسی وقت وہ شمال کی طرف بیالیس میل کے فاصلے پر تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ ابھی ایک پارٹی اسے تلاش کرنے کیلئے روانہ کی جائے گی۔"

اس گفتگو کے بیس منٹ بعد ایک طیارہ شمال کی جانب پرواز کر رہا تھا۔

وہاں سے فاصلہ زیادہ نہ تھا۔ جلد ہی ایئر سرچ پٹرول کے پائلٹ نے اس پہاڑ عمودی
چٹان کی ٹوٹی ہوئی انگلی دیکھ لی۔ پھر طیارے میں بیٹھنے والے سارجنٹ کو اطلاع دی۔

"ہم جائے حادثہ کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ کیمرے تیار کئے جائیں۔ میں عمودی
چٹان کے اطراف دو چکر لگاؤں گا۔ میرا خیال ہے دو راؤنڈ کافی ہوں گے۔"

سارجنٹ کا جواب سنتے ہی پائلٹ ایک دائرے کی صورت میں طیارے کو موڑنے
لگا کیپٹن آنکھوں سے دوربین لگا کر دیکھنے لگا۔ چٹان کی دو عمیق آغوش میں ایک ٹوٹا اور
بکھرا ہوا طیارہ نظر آ رہا تھا کیپٹن نے دوربین سے نظریں ہٹا کر دوسری کھڑکی کی جانب
دیکھا وہاں سارجنٹ کیمرے پر جھکا ہوا "ویڈیو" بنانے میں مصروف تھا وہ سوچنے لگا

کر اتنی بلندی سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ کیا انسانی جسم سلامت ہوں گے؟

اس کا جواب تصویروں سے مل سکتا تھا۔ پینا آپریمنٹ کی پرواز کے بعد جب وہ کنٹرول ہیڈکوارٹر میں واپس آئے تو سارجنٹ فوراً اپنی تصویروں کو ڈیولپ اور انلارج کرنے ڈارک روم میں چلا گیا۔ کیپٹن بے چینی سے ادھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ بے چینی اس قدر تھی کہ بار بار سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگا رہا تھا۔ ایک وقت آتا ہے کہ انتظار کی گھڑیاں ختم ہو جاتی ہیں لہذا وہ گھڑیاں بھی گزر گئیں۔ سارجنٹ ڈارک روم سے باہر آیا۔ پھر اس نے گیلی تصویریں سامنے میز پر پھیلا دیں۔

کیپٹن محدب شیشہ اٹھا کر باری باری ان تصویروں کو دیکھنے لگا جہاز کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کے درمیان انسانی جسم گندے گڑیوں کی طرح اوندھے سیدھے پڑے ہوئے تھے۔ ان میں ایک مرد تھا، ایک عورت تھی اور مرد کے قدموں کے پاس ایک بچہ نظر آ رہا تھا۔ طویل فاصلے سے کھینچی ہوئی تصویروں کو دیکھ کر یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ بچہ ہے یا بچی؟ وہ جو بھی ہو کیپٹن اسے دیر تک نہ دیکھ سکا۔ کیونکہ آخر اس کا اپنا بچہ بھی تھا تصویر کو دیکھتے ہی اس کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ اس نے مردہ سی آواز میں کہا "سب کے سب مر چکے ہیں"

اس نے فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کئے۔ پھر کسی سے کہنے لگا۔

"بہت ہی المناک حادثہ ہوا ہے ایسے حادثہ میں کوئی بھی زندہ نہیں بچ سکتا تھا اب ان لاشوں کو وہاں سے لانے کا مسئلہ ہے کیونکہ وہ عمودی چٹان بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر ہے۔"

وہ فون پر گفتگو کر رہا تھا اور سارجنٹ محدب شیشہ کے ذریعہ ان تصویروں کو دیکھ رہا تھا۔ یکبارگی وہ چونک کر اچھل پڑا اور چیخ کر بولا۔

"وہ سر! اسے دیکھئے۔ یہ۔ یہ۔ اس تصویر کو دیکھئے۔ بچہ زندہ ہے۔"

کیپٹن کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ کر گر پڑا۔ اس نے بھی جواباً حیرت سے چیخ کر پوچھا۔

"کیا واقعی بچہ زندہ ہے؟"

*

چولہے کی آنچ دو طرفہ تھی۔ ایک طرف سالن پک رہا تھا۔ دوسری طرف بانو پک رہی تھی۔ اس کے دماغ کے چولہے پر آصف کی یادیں ابل رہی تھیں۔ ایسا تو ہوتا ہے کہ ایک دل سے جاتا ہے تو دوسرا اس خالی دل کے آنگن میں آ جاتا ہے۔ آج سراج حسین آ رہا تھا۔ پھر اسی طرح آصف بھی آیا تھا بلکہ وہ عشق و محبت کے مرحلے سے گزر کر نہیں بلکہ سیدھے سادھے انداز میں دولہا بن کر اس کے گھونگھٹ تک پہنچ گیا تھا۔

اس نے گھونگھٹ کے پیچھے سے پہلی بار اُسے دیکھا تھا۔ ماں نے پہلے ہی سمجھایا تھا۔

"دیکھو بیٹی! مرد کی صورت شکل نہیں دیکھی جاتی۔ بس یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ ہاتھ پاؤں کا مضبوط ہو۔ وہ پرائی نظروں سے بچا کر رکھتا ہو۔ وہ جیسا بھی ہو، آخر مجازی خدا ہوتا ہے"

ماں نے آصف کو بیٹی کے لئے پسند کیا تھا اس لئے شادی سے پہلے صفائی پیش کر دی تھی، کہ آصف بہت زیادہ خوبصورت نہیں ہے اور بدصورت بھی نہیں ہے ویسے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ پتہ نہیں کب ہندو مسلم فسادات شروع ہو جائیں اور ہندو غنڈے بانو کو اٹھا کر لے جائیں۔ ماں بچاری بیٹھی رہ جائے گی کوئی عزت بچانے والا نہ ہوگا اگر اس کی شادی ہو جائے تو گھر میں ایک مرد آ جائے گا۔ اس بات کا اطمینان رہے گا کہ غنڈے بے باکی سے حملہ نہیں کریں گے۔

حالات ایسے تھے کہ بانو کسی آئیڈیل کا تصور نہیں کر سکتی تھی اور نہ ہی خوابوں کے شہزادے کا انتظار کرنے کیلئے سال دو سال جوانی کی دہلیز پر بیٹھی رہ سکتی تھی۔ آئے دن یہ خبریں سننے میں آتی تھیں کہ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ ان کے شہروں میں آگ اور خون کا یہ کھیل کسی بھی وقت کھیلا جا سکتا تھا اسی گھبراہٹ اور افراتفری میں وہ دلہن بن کر آصف کی پناہ میں آ گئی۔

احسن ایک دُبلا پتلا سا نوجوان تھا۔ صورت اچھی تھی مگر کوئی بھی عورت اُسے جوہر کے روپ میں نہیں، صرف شوہر کے روپ میں قبول کر سکتی تھی۔ بانو نے بھی اسے قبول کر لیا۔ شادی کے بعد ایک ماہ تک وہ گھر میں پڑا رہا۔ تین وقت کھاتا تھا پھر ڈکاریں لیتا ہوا باہر تفریح کے لیے نکل جاتا۔ اور رات کو واپس آکر محبت کے فرائض ادا کرتا تھا۔ ایک دن بانو کی ماں نے ٹوک دیا۔

"بیٹا! مرد محنت کرتے اچھے لگتے ہیں۔ تمہیں کوئی کام کرنا چاہیے۔"

"ماں جی! اس دیس میں مسلمانوں کو کام نہیں ملتا ہے۔ یہاں کی بھوکی جنتا میں ہم جیسوں کی تعداد زیادہ ہے۔"

"ایسا نہ کہو بیٹے! یہاں کروڑوں کی تعداد میں مسلمان ہیں۔ آخر وہ کسی نہ کسی طرح زندگی گزار رہے ہیں۔"

"پتہ نہیں کس طرح گزار رہے ہیں۔ مجھے کوئی راستہ سجھائی نہیں دیا۔ اسی لئے آپ کا داماد بن کر یہاں آگیا۔ آپ کی دکان اچھی چل رہی ہے۔ اللہ دے رہا ہے تو مجھ جیسے ایک بندے کو بٹھا کر کھلانے میں کیا نقصان ہے؟"

اُس کی باتیں سن کر بانو کو بہت غصہ آیا۔ اس کی ماں اپنے داماد سے یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ اُن پر بوجھ بنا ہوا ہے مگر ایک بیوی اپنے شوہر سے کہہ سکتی تھی۔ ماں کے جانے کے بعد اس نے کہا۔

"آپ مرد ہیں۔ آپ کو اپنی محنت مزدوری سے میرے اخراجات پورے کرنے چاہئیں۔ کیا یہ شرم کی بات نہیں ہے کہ آپ امی کی دکان پر تکیہ کئے بیٹھے ہیں۔"

"تم مجھے شرم نہ دلاؤ۔ شرم تمہیں آنی چاہیے۔ بتاؤ تم اپنے جہیز میں کیا لائی ہو؟ میں نے کبھی مطالبہ نہیں کیا۔ اب بات نکلی ہے تو بولنا پڑتا ہے۔ تمہاری ماں بوڑھی ہو چکی ہے۔ آج یا کل اللہ کو پیاری ہو جائیں گی۔ پھر اُن کی دکان تمہاری ہو گی اور تمہاری ہر چیز میری ہی ہو گی۔"

وہ حیرانی سے دیدے پھاڑ پھاڑ کر اُسے دیکھتی رہ گئی۔ حیرانی اس بات کی تھی کہ جب اُس نے کبھی سوچا نہ تھا ویسا اس کا شوہر تھا۔ دکان کو اپنی بیوی کا جہیز سمجھ رہا تھا اور اس کی ماں کے مرنے کا خواب دیکھ رہا تھا وہ صرف تین وقت کھانا اور اس کے ساتھ سونا جانتا تھا تیسرا کوئی کام اسے نہیں آتا تھا۔ وہ ایک دم سے پھٹ پڑی۔

"آپ میری امی کے مرنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اللہ کرے آپ کو موت آجائے اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ ایسے ناکارہ، کام چور اور مطلب پرست ہیں تو میں کبھی شادی نہ کرتی۔ دور ہو جائیے میری نظروں سے۔"

وہ مزید بحث کئے بغیر اطمینان سے گنگناتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی بانو کے سر سے آنچل گر گیا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا آخر اپنے سہاگ کا کچھ تو لحاظ ہونا چاہیے آنچل پھٹا پرانا ہی کیوں نہ ہو۔ سر کو ڈھانپ تو دیتا ہے دنیا والے اسے سر سے ننگی تو نہیں کہتے۔ غصے میں وہ بھول گئی تھی کہ مجازی خدا خواہ کیسا ہی ہو اس کی شان میں گستاخی نہیں کرنی چاہیے۔ اب وہ چلا گیا تو غصہ دھیما پڑ گیا اور غلطی کا احساس ستانے لگا۔ ماں رات کو دکان بند کر کے آئی تو اُس نے تسلی دی۔

"بیٹی گھبراؤ نہیں وہ آجائے گا۔ اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے اور نہ ہی وہ محنت سے چار پیسے کما سکتا ہے یہاں مفت کی روٹیاں ملتی ہیں۔ اس لئے وہ ضرور آئے گا۔"

مگر وہ رات کو نہیں آیا۔ صبح بانو ...... دکان کھولنے جایا کرتی تھی اس روز نہ جا سکی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ ضرور آئے گا۔ ماں اس کی پریشانیوں کو سمجھ کر خود ہی دکان داری کے لئے چلی گئی۔ دوپہر کو جب وہ روٹیاں پکا رہی تھی تو وہ دبے پاؤں آکر باورچی خانہ میں بیٹھ گیا۔ اُسے دیکھ کر بانو کو یوں لگا جیسے وہ اپنا کوئی نہیں ہے مگر گھر کا ایک سامان ہے جو گم ہونے کے بعد مل گیا ہے اُسے خوشی ہوئی لیکن غصہ دکھانا بھی ضروری تھا اس نے غصے سے روٹیوں کا چھابا اس کے آگے پٹخ دیا۔ ہانڈی سے سالن نکال کر دیا۔ اسی طرح غصہ

بھی دکھایا اور اس کی خاطر تواضع بھی کی۔ پھر طنز بھی کیا۔

"جس کے ساتھ رات گزار کر آئے ہو کیا اس نے روٹی نہیں کھلائی۔"

اس نے ایک لقمہ چباتے ہوئے کہا۔

"میں نے رات اسٹیشن کی سرائے میں گزاری ہے کل سے کچھ نہیں کھایا بھوکا پیاسا تمہیں یاد کرتا رہا۔"

بانو کا دل بھر آیا۔ بیچارہ کل سے بھوکا تھا وہ سچ کہتا ہے یاد کرتا ہوگا بھوک پیاس کے وقت مجھے یاد کرتا ہے کسی نہ کسی طرح میرا محتاج ہے بیچارہ۔ وہ وقت کی کیا کرے گا۔ تو کون سا بوجھ بن جائے گا کم از کم نام تو ہوگا کہ اس گھر میں ایک مرد بھی رہتا ہے۔

یہ سوچ کر وہ محبت سے سمجھانے لگی "آپ کہیں ملازمت کے لئے پریشان نہ ہوں۔ میں صبح سے دوپہر تک دکان میں بیٹھتی ہوں میری جگہ آپ دکان سنبھالا کریں۔ امی خوش ہو جائیں گی کہ آپ کو ذمہ داری کا احساس ہوگیا ہے۔"

آصف راضی ہوگیا۔ بانو تین دن تک اس کے ساتھ دکان پر جاتی رہی۔ اسے تمام چیزوں کی قیمت اور گاہکوں سے نمٹنے کے گر سکھاتی رہی۔ جتنا اس نے سکھایا، آصف نے اس سے کچھ زیادہ ہی سیکھ لیا۔ آئے دن موقع پا کر گلے سے روپے چرانے لگا۔ بانو کی ماں گلے کا وزن خوب سمجھتی تھی اس نے سمجھ لیا کہ دکان کی آمدنی میں کچھ ہیرا پھیری ہو رہی ہے مگر ساس اور داماد کے رشتہ کی لاج بھی رکھنی تھی اس لئے اس نے روزانہ دو چار روپے کی چوری برداشت کر لی۔ بانو کو بھی سمجھا دیا کہ آصف کو شرمندہ نہ کرو۔ سمجھ لو کہ وہ گلے میں سے اپنا جیب خرچ نکال لیا کرتا ہے۔

ماں بیٹی بڑی مصلحت سے کام لے رہی تھیں مگر چور کا حوصلہ بڑھنے لگا۔ رفتہ رفتہ چلا کر وہ نشہ کیا کرتا تھا۔ کنگال ہونے کے بعد نشہ چھوٹ گیا۔ اب پھر جیب میں خاصی رقم رہنے لگی تو اس نے دارو پینا شروع کر دی۔ اس پر ماں بیٹی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا ایک رات بانو نے اسے خوب سنائیں۔

"تمہیں شرم نہیں آتی۔ شراب پی کر گھر آتے ہو۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم شرابی اور جواری ہو۔ نکمے اور بے غیرت ہو تمہاری بیوی بن کر رہنے سے بہتر ہے کہ میں بیوہ بن کر رہوں۔ اگر تمہیں موت نہیں آتی ہے تو کہیں جا کر ڈوب مرو۔ مرنے کا حوصلہ نہیں ہے تو صبح ہونے سے پہلے اس گھر سے چلے جاؤ۔"

وہ مدہوشی کی حالت میں بیوی کی کھری کھری باتیں سنتے سنتے سو گیا۔ آدھی رات کے بعد بانو بھی اپنی بدنصیبی کا دکھڑا روتے روتے سو گئی۔ صبح ماں کے چیخنے چلانے سے اس کی آنکھ کھلی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

"آصف کہاں ہے؟"

بانو کو اس کا بستر خالی نظر آیا۔ ماں نے کہا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ میں نے دکان کا نیا اسٹاک خریدنے کے لئے پانچ ہزار روپے رکھے تھے۔ وہ روپے نہیں ہیں۔ ذرا تم اپنی الماری تو دیکھو۔"

بانو الماری کے پاس گئی تو وہ کھلی ہوئی تھی جس دراز میں اس کے زیورات رکھے ہوئے تھے اب وہاں ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نظر آ رہا تھا اس نے اسے کھول کر پڑھا۔ لکھا تھا۔

"بانو بیگم! اب تم میری بیوی نہیں ہو تم نے کہا تھا کہ مجھ جیسے کی بیوی بننے کے بجائے بیوہ بن کر رہنا چاہتی ہو۔ مجھ میں مرنے کا حوصلہ نہیں ہے اس لئے با ہوش و حواس تمہیں طلاق دیکر جا رہا ہوں۔ میری تلاش فضول ہے۔ فقط آصف۔"

طلاق نامہ پڑھتے ہی بانو چکرا کر گرنے لگی۔ ماں نے بڑی مشکل سے اُسے سنبھال کر بستر پر لٹا دیا۔ پھر وہاں سے بھاگی بھاگی محلے کی لیڈی ڈاکٹر کو بلا لائی۔ اس نے ڈاکٹر کو یہ نہیں بتایا کہ بیٹی پر کیسی قیامت ٹوٹ پڑی ہے پچھلی رات تک وہ سہاگن تھی اور اب اس کا سہاگ اجڑ گیا ہے اجاڑنے والا گھر سے نقدی اور زیورات بھی سمیٹ کر لے گیا ہے

اس نے لیڈی ڈاکٹر کو صرف اتنا ہی بتایا کہ پچھلے دو دنوں سے بانو علیل تھی آج بستر سے اٹھتے ہی چکرا کر گر پڑی۔

لیڈی ڈاکٹر نے اس کی نبض دیکھی۔ پھر اسے اِدھر اُدھر ٹٹول کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"گھبرانے کی بات نہیں ہے ماں جی! تمہاری بیٹی ماں بننے والی ہے"

ماں چند لمحوں تک گم صم کھڑی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ خبر سن کر اسے خوش ہونا چاہیئے یا اپنا سر پیٹنا چاہیے۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ بیٹی ماں بننے والی تھی افسوس کا مقام تھا کہ وہ ایک چور کی اولاد کو جنم دے گی۔

بانو کو ہوش آنے کے بعد لیڈی ڈاکٹر اسے بھی خوشخبری سنا کر چلی گئی۔ وہ طلاق کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی خزاں میں پھول نہیں کھلتے۔ اگر کھلتے بھی ہوں تو خوشبو سے خالی ہوتے ہوں گے بانو بھی ایسے وقت ماں کی ممتا سے اور بچے کی خوشبو سے خالی رہی۔ بعد کی بات ہوگی کہ کبھی ممتا جوش میں آئے گی، ابھی تو اُسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی کوکھ میں بچہ نہیں بلکہ جانے والے چور کے نقشِ قدم ہیں۔

اس روز ماں بیٹی نے دکان نہیں کھولی۔ گھر میں تمام دن چپ چپ سی رہیں۔ بانو مطلقہ عورت ہو کر ہتک محسوس کر رہی تھی۔ یہ خیال اُسے مار رہا تھا کہ پاس پڑوس کی سہاگنیں اسے اپنے پاس نہیں بٹھائیں گی۔ کیونکہ وہ سہاگ کی دہلیز کے باہر پھینک دی گئی تھی۔ اب اس کی قابلِ فخر سماجی حیثیت نہیں تھی ایسا سوچتے وقت وہ خود کو ایک خوبصورت بچے کے تصور سے بہلانے کی کوشش کرتی رہی۔ اپنے دل کو سمجھاتی رہی کہ اس دنیا میں کوئی اپنا نہیں ہوتا۔ صرف اپنے جگر کا ٹکڑا ہی اپنا ہوتا ہے وہ اپنے بچے کے سہارے زندگی گزار دے گی۔

دوسری طرف ماں سوچ رہی تھی کہ بانو اپنی پہاڑ سی جوانی کیسے گزارے گی؟ صرف بڑھاپا ایسا ہے جو اولاد کے سہارے گزرتا ہے ورنہ جوانی کسی جوان کا ہاتھ تھامے بغیر آگے بڑھے تو کہیں نہ کہیں ٹھوکر کھا جاتی ہے۔

لہٰذا اس بچے کو پیدا نہیں ہونا چاہیئے اگر پیدا ہو جائے تو زندہ نہیں رہنا چاہیئے۔ ایک تو یہاں مسلمان لڑکوں کا قحط پڑا ہوا ہے اگر کوئی بانو کے حُسن سے متاثر ہو کر آئے گا تو اسے بچے والی دیکھ کر واپس چلا جائے گا۔ بانو تو آئندہ بھی ماں بن سکتی ہے لیکن گود میں ایک بچہ رکھ کر سہاگن نہیں بن سکتی۔

ماں نے دل پر جبر کرتے ہوئے اور دونوں مٹھیاں سختی سے بھینچتے ہوئے فیصلہ کیا۔

"وہ بچہ زندہ نہیں رہے گا"

"ہاں وہ بچہ زندہ ہے"

میز پر رنگین تصویریں بکھری پڑی تھیں۔ سارجنٹ نے دو عدد تصویریں اٹھا کر کیپٹن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آپ ان تصویروں کو ذرا غور سے دیکھیں"

کیپٹن محدب شیشہ ہاتھ میں لے کر توجہ سے دیکھنے لگا۔ سارجنٹ کی آواز اس کے کانوں میں اتر رہی تھی۔

"ہمارے طیارے نے علوی چٹان کے دو چکر لگائے تھے۔ یہ تصویر پہلے راؤنڈ میں اتاری گئی تھی۔ اس تصویر میں بچہ بے حس و حرکت پڑا ہوا ہے۔ دوسرے راؤنڈ میں یہ تصویر اتاری گئی تھی اس میں بچے کے ہاتھ پاؤں ذرا اٹھے ہوئے نظر آ رہے ہیں وہ ہاتھ پاؤں جھٹک رہا ہے"

کیپٹن کے جس ہاتھ میں تصویر تھی وہ ہاتھ کانپنے لگا۔ بچہ ہاتھ پاؤں جھٹک رہا تھا یعنی اپنی زندگی کے لئے لڑ رہا تھا کیپٹن کا دل تڑپ تڑپ کر کہہ رہا تھا کہ اس کا اپنا بچہ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ کر ہاتھ پاؤں ہلاتے ہوئے سگنل دے رہا ہے "بچاؤ۔ مجھے بچاؤ......"

وہ بچہ صرف کیپٹن کو نہیں۔ اس صدی انسانیت کو تڑپانے والا تھا۔ اس نے فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے کے بعد کہا۔

"میں کیپٹن ہیری رام بول رہا ہوں۔ طیارے کو جہاں حادثہ پیش آیا ہے وہاں ایک بچہ زندہ ہے۔ فوراً امدادی پارٹی روانہ کرو۔ مجھے بلا تاخیر یہ رپورٹ ملنی چاہیئے کہ اتنی بلندی سے کس طرح بحفاظت اتارا جا سکتا ہے۔"

یہ حکم دینے کے بعد کیپٹن نے فلائنگ کلب سے رابطہ قائم کیا۔

"میں کیپٹن ہیری رام کنٹرول سینٹرل سے بول رہا ہوں۔ آپ فوراً تفصیل رپورٹ پیش کریں کہ کس شخص نے طیارہ ایف سی ون۔ ٹو ٹو چارٹرڈ کیا تھا؟ طیارے میں کتنے افراد تھے؟ ان میں ایک بچہ بھی ہے اس کا تعلق کس سے ہے؟"

اس کے بعد وہ کسی تیسری جگہ نمبر ڈائل کرنے لگا مگر اب وہ تنہا پریشان نہیں تھا مختلف متعلقہ اداروں میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹیلیفون کی گھنٹیاں چیخ رہی تھیں ایک ایک فون کی چیخ و پکار کے پیچھے جو لوگ تھے ان کے دماغوں کی اسکرین پر صرف ایک معصوم بچہ تھا جو دو لاشوں کے پاس پڑا ہوا زندگی کو پکار رہا تھا۔

*

آٹھ ماہ سے وہ بچہ بانو کے وجود میں چھپ کر کروٹیں بدل رہا تھا وہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر سوچتی رہتی تھی۔

"میرا بچہ کیسا ہوگا؟ اپنے باپ کی طرح یا میری طرح؟"

ماں نے بار بار سمجھایا۔ "وہ جیسا بھی ہوگا اسے اپنے دل سے نوچ کر پھینک دو تمہیں سمجھاتے سمجھاتے آٹھ ماہ گذر گئے۔ اگر تم پہلے ہی مان جاتیں تو وہ بچہ آسانی سے ضائع ہو جاتا۔ اب بھی وقت ہے بانو، اپنے آپ پر رحم کرو۔"

"امی کیا آپ ہوش و حواس میں نہیں ہیں؟ کیا آپ میرے بچے کی قاتل بننا چاہتی ہیں؟"

"نہیں بیٹی! ہم دونوں کی بھلائی چاہتی ہوں۔ تمہاری بھلائی اس میں ہے کہ تم پہلے جیسی بن جاؤ۔ ہم یہ مکان فروخت کر کے کسی دوسرے شہر میں چلے جائیں گے کوئی زبان سے کہے گا کہ کبھی تم سہاگن بنی تھیں اور ایک بچے کو جنم دیا تھا۔ بچے کی بھلائی اس میں ہے کہ وہ کسی فلاحی ادارے میں پرورش پائے۔"

"نہیں امی! میں اپنے ہاتھوں سے اپنے جسم کے ایک حصے کو کاٹ کر نہیں پھینک سکتی۔ میں اس معصوم سے جدا ہونے کا تصور نہیں کر سکتی۔"

"تم کبھی آصف سے بھی جدا ہونے کا تصور نہیں کرتی تھیں۔ مگر اب صبر کر لیا۔ اسی طرح رفتہ رفتہ بچے کے لئے بھی صبر آ جائے گا۔"

"آپ ضد کیوں کر رہی ہیں۔ میں اب شادی نہیں کروں گی بس دیکھ لی مرد کی دوستی۔ ایک نے مجھے داغ لگایا ہے۔ دوسرا کوئی آئے گا تو مجھے داغدار کہہ کر طعنہ دے گا۔ آپ ایسی باتیں نہ کریں ورنہ میں گھر سے چلی جاؤں گی۔"

ماں ڈر کر خاموش ہو گئی کہ کہیں بیٹی سے بھی ہاتھ نہ دھو بیٹھے وہ ممتا کو سمجھ رہی تھی۔ جیسے وہ اپنی بیٹی کی آئندہ زندگی سنوارنے کے لئے دن رات پریشان رہتی تھی اسی طرح بیٹی اپنی ممتا سے مجبور تھی اور خیال ہی خیال میں بچے کو جنم دیکر اسے سینے سے لگا کر چومتی رہتی تھی۔ یہ نہیں سوچتی تھی کہ ایک بچے کی وجہ سے اس کی جوانی غارت ہو جائے گی۔

جب وہ بانو کو سمجھا کر تھک گئی تو یہ سوچ کر خاموش ہو گئی کہ وقت کی کوئی ٹھوکر ہی اسے سمجھائے گی۔ یہ آجکل کے بچے اپنی من مانی کرتے ہیں بزرگوں کے تجربات کو یکسر جھٹلا دیتے ہیں لیکن وقت بڑا سنگدل ہوتا ہے وہ ایک ہی جھٹکے میں ماں کو بھی سنگدل بننا سکھا دیتا ہے۔ ایک رات بانو دردِ زہ سے تڑپ رہی تھی اور باہر قیامت کا شور برپا تھا بہت دور سے "ہر ہر مہادیو" کی آوازیں آ رہی تھیں اور مسلمان جوان "اللہ اکبر" کے نعرے لگا رہے تھے۔

پورے محلے میں وہی ایک گھر ایسا تھا جہاں کوئی مرد نہیں تھا۔ کوئی خاوند تھا
ماں پریشانی کے عالم میں کبھی بانو کے پاس بیٹھ جاتی تھی کبھی بھاگی بھاگی دوسرے کمرے میں
جا کر کھڑکی کھول کر دیکھتی تھی۔ باہر جو انسان تھے وہ درندے بن گئے تھے۔ نہ عورتوں کی
عزت کا پاس تھا نہ انسانی زندگی کی کوئی قیمت تھی۔ پانی کی طرح لہو بہایا جا رہا تھا۔

ماں کو واپس آنے میں دیر ہوئی تو وہ درد سے تڑپتی اور کراہتی ہوئی بستر سے
اٹھ گئی۔ پلنگ کا سہارا لیکر دیوار تک پہنچ گئی پھر اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کر باہر کا
منظر دیکھا تو حلق سے چیخ نکل گئی۔ ایک وحشی درندہ ایک نوزائیدہ بچے کو
فضا میں اُچھال کر نیزے کی انی پر روک رہا تھا بس اس سے زیادہ وہ کچھ نہ دیکھ سکی۔ ایک
دم سے چکرا کر فرش پر گر پڑی۔

ماں اپنی بیٹی کی چیخ سن کر دوڑتی ہوئی کمرے میں آئی تو اب بانو تنہا نہیں تھی۔
اس کے قدموں کے پاس فرش پر ایک نوزائیدہ بچہ خون میں لتھڑا ہوا چیخ رہا تھا۔ باہر
درندے لہو اچھال کر زندگی چھین رہے تھے اندر ایک ماں اپنے لہو کے چھینٹوں سے ایک
نئے انسان کو زندگی دے چکی تھی وہ مارے دہشت کے یہ بھول گئی تھی کہ دردِ زہ کیا ہوتا
ہے اور وہ تخلیق کے کرب سے کیسے گزر گئی۔ اسے ایک ہی منظر یاد تھا کہ بچہ
نیزے پر اچھالا جا رہا ہے وہ جنونی حالت میں چیخنے لگی۔

"امی۔ بچائیے۔ میرے بچے کو بچائیے۔ وہ ظالم اُسے چھین کر لے جا رہے
ہیں۔ وہ میرے بچے کو مار ڈالیں گے۔"

اس کی ماں نے بچے کو کپڑے میں لپیٹ کر سینے سے لگا لیا۔ پھر روتی ہوئی بولی۔
"بیٹی اب تو خدا ہی ہماری مدد کر سکتا ہے۔ اس دن کے لئے سمجھاتی تھی کہ اسے
جنم نہ دو۔ مہذب درندوں کی اس دنیا میں ہم اپنی حفاظت نہیں کر سکتے۔ پھر اس بچے کو
کہاں لے جا کر چھپائیں گے؟"

باہر ایک مکان دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔ اس کے لپکتے ہوئے شعلوں کا عکس کھڑکی
کے راستے بانو کے چہرے پر پڑ رہا تھا جیسے خود اس کا چہرہ جل رہا ہو۔ اس کا دل سلگ رہا
ہو۔ وہ تھرتھراتی ہوئی آواز میں بولی۔

"اسے کہیں بھی چھپا دیجئے۔ اسے لے کر یہاں سے بھاگ جائیے۔ میں صرف
اپنے بچے کی سلامتی چاہتی ہوں۔ آپ میری فکر نہ کریں مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔"

"نہیں بانو! تم اپنے بچے کی سلامتی چاہتی ہو اور میں تمہاری سلامتی کے لئے زندہ
ہوں۔ اب یہ وقت آن پڑا ہے تو میری بات مان لو۔ میں اس بچے کو ایسی جگہ چھپا دوں گی
جہاں اس پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔"

"کہاں؟" بانو نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

"کہیں بھی۔ تم ابھی یہ نہ پوچھو۔ اپنے دل پر پتھر رکھ لو۔ تم اسے کبھی نہیں دیکھ سکو گی
مگر یہ زندہ سلامت رہے گا۔"

"نن۔ نہیں۔۔ میں اپنے بچے۔۔۔۔۔"

اس کا انکار اس کے حلق میں اٹک کر رہ گیا۔ کھڑکی کے قریب ایک کرخت آواز سنائی
دی۔ پھر شعلوں کی روشنی میں ایک سکھ کا خونی چہرہ نظر آیا۔ اس کا گنڈاسا لہو سے بھیگا ہوا
تھا۔ وہ "ست سری اکال" کہتا ہوا کھڑکی کے راستے سے کمرے میں آنا چاہتا تھا۔ اسی وقت
اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ کسی نے اس کی پشت پر خنجر گھونپ دیا تھا وہ کھڑکی پر سے
الٹ کر باہر گر پڑا۔ ماں نے دوڑ کر کھڑکی کو اندر سے بند کر دیا اور روتی ہوئی بولی۔

"بانو! تم خود غرض ہو۔ یہ ممتا نہیں ہے بچے سے دشمنی ہے۔"

وہ ہذیانی انداز میں چیخنے لگی۔

"میں خود غرض نہیں ہوں۔ میں اپنے بچے کی دشمن نہیں ہوں۔ اسے لے جائیے
ابھی لے جائیے میں اس کی جدائی برداشت کر لوں گی مگر یہ الزام نہیں اٹھاؤں گی کہ ماں کی

محبت ہی بچے کو مار ڈالتی ہے۔"

ماں تیز قدموں سے چلتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی تاکہ اب بچے کی آواز بھی بانو کے کان میں نہ پڑے۔ تھوڑی دیر میں صبح ہونے والی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ باہر کا ہنگامہ سرد پڑتے ہی وہ بچے کو یتیم خانہ میں چھوڑ آئے گی۔

بانو کمرے کے فرش پر تنہا پڑی ہوئی تھی۔ جب بچہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اس نے آنسو بھری آنکھیں میچ لیں۔ پھر ایک طویل سانس اس طرح چھوڑی جیسے اندر سے بالکل خالی ہو جانا چاہتی ہو۔ خالی تو وہ ہو گئی تھی۔ اب لٹنے کیلئے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ اب کوئی چور، کوئی قاتل اس کے دروازے پر نہیں آسکتا تھا۔ اب وہ ایک غریب مفلس کی طرح آرام سے سو سکتی تھی۔

دوسری صبح بستر پر اس کی آنکھ کھلی تو آس پاس کا ماحول ایسا خالی ایسا ننگا نظر آیا جیسے اتنی بڑی دنیا کے تن بدن سے آخری کپڑا بھی اتار لیا گیا ہو۔ ماں سامنے کھڑی تھی۔ اس کی جھکی جھکی سی نظریں کہہ رہی تھیں کہ اس نے ایک معصوم بچے کو اس کی ماں سے جدا کر دیا ہے۔ بانو کی آنکھوں میں پھر آنسو آگئے اس نے پوچھا۔

"میرا لعل کہاں ہے؟ میرے بیٹا ہوا تھا نا؟"

"ہاں بالک آشرم میں....."

"بالک آشرم؟" بانو جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "آپ میرے بچے کو ہندوؤں کے آشرم میں کیوں چھوڑ آئی ہیں۔ آپ کو کیا ہو گیا ہے امی؟"

"میں مجبور تھی بانو! مسلمانوں کی بستی ویران ہو رہی ہے۔ یتیم خانے میں گئی تو وہ خالی پڑا تھا۔ کچھ بچے مارے گئے۔ باقی بھاگ گئے۔ یتیم خانے کے کرتا دھرتا بھی نہیں تھے۔ میرے دل میں بات آئی کہ انسان انسان کا دشمن ہوتا ہے مگر مذہب مذہب کا دشمن نہیں ہوتا۔ کوئی دھرم نفرت اور دشمنی نہیں سکھاتا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ جس دھرم کے چند لوگ

تمہارے بچے کو مار ڈالنا چاہتے ہیں وہ بچہ فی الحال اسی دھرم کی پناہ میں محفوظ رہ سکتا ہے۔"

بانو چند لمحے تک ماں کو دیکھتی رہی۔ پھر روتی ہوئی بولی۔

"آپ نے بچے سے صرف اس کی ماں کو نہیں، اس کے ایمان کو بھی چھین لیا۔ کیا ایسا کرتے وقت آپ کے دل سے بھی ایمان نکل گیا تھا؟"

"مجھے طعنے نہ دو۔ میں نے حالات سے مجبور ہو کر خدا کے بھروسے پر ایسا کیا ہے خدا کو منظور ہو گا تو وہ آشرم میں بھی صاحبِ ایمان رہے گا۔"

"کیسے رہے گا امی۔ آپ مجھے بہلا رہی ہیں۔"

"اسے بہلاوہ سمجھ کر صبر کر لو۔ اب یہاں سے چلنے کی تیاری کرو۔ ہم اس شہر میں نہیں رہیں گے....."

*

اناتھ بالک آشرم کے ایک کمرے میں اٹھائیس برس کی ایک حسین عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے بال شانوں تک ترشے ہوئے تھے سیاہ رنگ کے ماتمی بلاؤز اور اسکرٹ میں اس کے حسن کی چاندنی کھل رہی تھی۔ اس کا نام میریا تھا۔

میریا روزنامہ سندیس کی صفحہ اوّل کی رپورٹر تھی۔ اخبار کے حلقے میں وہ بہت ہی تیز طرار سمجھی جاتی تھی۔ لیڈروں اور سیاستدانوں کے راز اڑا کر انہیں اپنے اخبار کی زینت بنا دیتی تھی بڑے بڑے لوگ اس سے خوفزدہ بھی رہتے تھے اور خار بھی کھاتے تھے لیکن اس روز میریا تیز و طرار نظر نہیں آرہی تھی اور نہ ہی بالک آشرم سے کسی بچے اور اس کی ماں کا کوئی راز چرا کر اخبار میں شائع کرنے کی غرض سے آئی تھی۔

وہ خود ایک راز بن کر اس آشرم میں پہنچی تھی اور بار بار اس دروازے کو دیکھ رہی تھی جس کے پیچھے پنڈت جی کسی سے باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ وہ اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔ کتنے ہی آرام سے بیٹھو، پر انتظار کانٹے کی طرح چبھتا ہے۔ اس لئے وہ رہ رہ کر

itsurdu.blogspot.com

پہلو بدل رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد آشرم کی بوڑھی ملازمہ اس کے پاس آئی تو وہ جلدی سے
اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ملازمہ نے کہا۔
"بیٹھو بیٹی۔ بیٹھ جاؤ۔ ابھی ذرا دیر ہے۔ پنڈت جی خود ہی تمہیں بلائیں گے۔"
وہ بیٹھ گئی۔ ملازمہ نے سامنے ایک لکڑی کی چوکی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
"کیا کلجگ ہے۔ مائیں اپنے بچوں کو چھوڑ دینے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ آج سویرے میں
آشرم کا دروازہ کھول رہی تھی۔ میں نے دیکھا ایک بوڑھی عورت ایک ننھے بچے کو دروازے
پر رکھ کر جا رہی ہے میں نے اسے پکارا تو وہ بھاگتی چلی گئی۔ مجھے ..... دمے کی بیماری ہے نہیں تو
میں دوڑ کے اسے پکڑ لیتی۔"
میریا نے وقت گزارنے کیلئے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔
"تم نے اس عورت کو اچھی طرح دیکھا تھا؟"
"اچھی طرح تو نہیں، مگر ہاں دیکھا تھا۔ اس کے ماتھے میں سیندور نہیں تھا۔ یا تو وہ
ودھوا (بیوہ) ہو گی یا پھر مسلمان۔"
"ایسے وقت جب کہ ہندو مسلم فسادات ہو رہے ہیں۔ ایک مسلمان عورت اپنے بچے کو
اس آشرم میں کیوں چھوڑے گی؟"
"بیٹی! جس کا کوئی باپ نہ ہو اس کا کوئی دھرم بھی نہیں ہوتا۔ وہ بچہ اس بوڑھی
کا نہیں ہو سکتا۔ اس کی کسی جوان بہن یا بیٹی کا ہو گا۔"
بوڑھی ملازمہ کی یہ بات میریا کے دل کو لگ گئی کہ جس کا باپ نہ ہو اس کا کوئی مذہب
بھی نہیں ہوتا۔ واقعی دنیا کا ہر مذہب مرد کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ محمد احمد۔ رام پرشاد
اور ٹونی ہڈسن جیسے ناموں والے کسی باپ کے جائز بچے کا مذہب سمجھ میں آجاتا ہے یہ مرد
کیلئے بڑے فخر کی بات ہے اور یہ بھی بڑے فخر کی بات ہے اس کے ناجائز بچے کا مذہب سمجھ
میں نہیں آتا۔ جب کہ وہ اپنی سوسائٹی میں بیٹھا روزے نماز کی باتیں کر رہا ہو گا۔ یا بھگوان کی مورتی

کے سامنے ڈنڈوت کر رہا ہو گا یا مسیح کے بت کے سامنے سینہ پر صلیب کا نشان بنا رہا ہو گا۔
کیا مذہب یا دھرم کا تقدس اسی طرح قائم رہ سکتا ہے؟
میریا نے پوچھا۔ "جو بچہ تمہارے دروازے پر پڑا ہوا تھا کیا اسے آشرم میں رکھ لیا
گیا ہے؟"
"ہاں یہ آشرم ایسے ہی بچوں کے لئے ہے۔"
"مگر آشرم کے کھاتے میں بچے کے باپ کا نام اور دھرم کیا لکھا جاتا ہے؟"
"یہاں بچوں کے ماں باپ کے نام نہیں لکھے جاتے کیونکہ یہاں آنے کے بعد بچوں
سے ان کے تمام رشتے ناطے ٹوٹ جاتے ہیں اور وہ بچے ہمارے دھرم کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔"
"ہاں جب کوئی نام نہ ہے تو بچے کسی بھی دھرم کی گود میں جا سکتے ہیں ماں باپ کو
کسی پہلو سے اعتراض کرنے کا حق نہیں رہتا۔"
میریا نے تھکے ہوئے انداز میں آنکھیں بند کر لیں مگر دوسرے ہی لمحہ اس نے چونک کر
آنکھیں کھول دیں۔ اس کے سامنے کمرے کا دروازہ کھل گیا تھا۔ کھلے ہوئے دروازے پر
بائیس برس کی ایک حسینہ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے بدن پر قیدیوں کا لباس
تھا اور اس کے آس پاس دو سپاہی کھڑے ہوئے تھے ان کے پیچھے ایک پولیس انسپکٹر نظر آ رہا تھا۔
میریا نے اس قیدی حسینہ کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔ وہ بھارتی فلموں کی سب سے مشہور
اداکارہ پشپا رانی تھی۔ دیش کے تمام فلمی رسالے اور نوجوانوں کے تمام بیڈ روم اس کی تصویروں کے
بغیر مکمل نہیں ہوتے تھے۔ اب وہ قیدی کے لباس میں اور آشرم کے پس منظر میں ایسی تصویر بنی
ہوئی تھی جسے وہ خود اپنی زندگی کے کسی بھی خوبصورت کمرے میں لگانا ناپسند کرتی۔ ایسی تصویریں
تو صرف تقدیر کے بے حس کیمرے میں اترتے ہیں
اس کے پیچھے کھڑے ہوئے پولیس انسپکٹر نے کہا۔
"تم رک کیوں گئیں آگے بڑھو۔"

پشورانی چونک کر آگے بڑھ گئی۔ اس کے بوجھل قدموں سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ کسی قیامت سے گزر رہی ہے اور اپنے پیچھے اپنی زندگی کا اہم سرمایہ چھوڑ کر جا رہی ہے وہ چلتے چلتے رک گئی۔ جنونی انداز میں اپنے سر کو انکار میں ہلانے لگی۔

"نہیں نہیں۔ میں اسے چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ میرا لعل میرا بچہ۔ مجھے واپس کر دو..."

وہ پلٹ کر واپس کمرے کی طرف بھاگنی چاہتی تھی مگر سپاہیوں نے پکڑ لیا۔ پھر انسپکٹر کے حکم پر اسے کھینچ کر باہر لے جانے لگے۔ میریا کا کلیجہ کانپنے لگا۔ ایک ماں کو اس کے بچے سے جدا کیا جا رہا تھا۔ ایسا تو کوئی قانون نہیں ہے کہ عورت کے جسم کے کسی حصے کو کاٹ کر یا نوچ کر اس سے الگ کر دیا جائے۔ پھر وہ قانون کے محافظ اس جنم جلی کو زبردستی کہاں لے جا رہے تھے اگر پشورانی نے پاپ کیا تھا تب بھی دنیا کی کسی قانونی کتب میں یہ نہیں لکھا ہے کہ بچے کو اس کی پاپن ماں سے جدا کر دیا جائے پھر یہ قصہ کیا ہے۔ دوسروں کے رازوں کو ٹٹول کر کہانیاں بنانے والی میریا نے سوچا۔ اس المناک منظر کے پیچھے ایک ملکہ اور اس کے بچے کی دردناک داستان ہے اس داستان کو کریدنا چاہیئے۔

بعض اوقات زندگی اتنی فرصت نہیں دیتی کہ دوسروں کی زندگی میں جھانک کر دیکھا جا سکے۔ میریا کا دھیان بٹ گیا۔ پنڈت جی نے دروازہ کھول کر کہا۔

"بیٹی میریا۔ اندر آجاؤ"

میریا سر جھکا کر دروازے کے پاس آئی۔ پھر پنڈت جی کے سامنے سے گزرتی ہوئی کمرے میں آکر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ پنڈت جی نے دروازے کو بند کرنے کے بعد میز کے دوسری طرف ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"مجھے پنڈت گردھاری لال کہتے ہیں بیٹی ہم جان بوجھ کر کسی دوسرے دھرم کے بچے اپنے ہاں نہیں رکھتے۔ ہاں کوئی مجبوری ہو تو دوسری بات ہے۔ اب یہی دیکھو کہ آج سویرے سویرے کوئی بوڑھی عورت ہمارے دروازے پر ایک بچے کو چھوڑ کر چلی گئی۔ ایسی

حالت میں ہم بچے کو کہیں پھینک نہیں سکتے۔ بھگوان کسی کو اتنا کٹھور نہ بنائے"

میریا نے قدرے مایوس ہو کر پوچھا۔

"کیا آپ میرے بچے کو نہیں رکھیں گے؟ میں۔ میں ایک عیسائی ہوں"

"بیٹی! تم اپنے دھرم کے انوسار اپنی عیسائی مشنری میں اپنے بچے کو رکھ سکتی تھیں۔ میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ روزنامہ سندیس کے ایڈیٹر سودیش مکرجی نے یہاں آکر ہم سے پرارتھنا کی تھی کہ ہم تم سے کچھ نہ پوچھیں۔ تمہارے بچے کو ہندو سمجھ کر رکھ لیں۔ میں تم سے صرف یہ پوچھنے کے لئے بلایا ہے کہ بچے کا دھرم بدل جائے تو تمہیں انکار تو نہیں ہوگا؟"

"نہیں۔ یہ بات میری سمجھ میں آگئی ہے کہ ہر مذہب میں تھوڑے بہت شیطان ہوتے ہیں ان کے بیچ اگر کسی بھی مذہب کی پناہ میں اگر انسان بن سکیں تو یہ بڑی بات ہوگی۔ مجھے انکار نہیں ہے"

"بس میں یہی معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اب میرے من میں یہ بات کھٹکتی نہیں رہے گی کہ میں نے کسی کے بچے کو اپنی اچھا سے اپنے دھرم میں شامل کر لیا ہے۔ اب تم جا سکتی ہو"

میریا جانے کے لئے اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ وہ ہچکچاتی ہوئی بولی۔

"مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میں اپنی آدھی جان یہاں چھوڑ کر جا رہی ہوں"

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پنڈت گردھاری لال نے کہا۔

"تم بڑی دھیرج والی ہو۔ اتنی خاموشی سے آنسو بہا رہی ہو۔ دوسری مائیں تو یہاں گود خالی کرتے وقت دھاڑیں مار مار کر روتی ہیں ابھی تم نے ایک ناری کو کس طرح سے چیختے چلاتے اور روتے دیکھا ہوگا۔"

وہ اثبات میں سر ہلا کر بولی۔

"ہاں پشورانی کی آنکھ اور میرا لعل دونوں ساتھ ساتھ رو رہے تھے۔ میں یہاں

سے جانے سے پہلے آئی۔ آخری بار اپنے بچے کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ اس آشرم میں یہ میرا آخری دن اور آخری خواہش ہے پھر یہاں کبھی نہیں آؤں گی۔"

"بیٹی! خواہش کبھی آخری نہیں ہوتی۔ جب تک سانس چلتی رہتی ہے ایک کے بعد دوسری خواہش چلتی رہتی ہے۔ میں تمہارا دل نہیں توڑوں گا مگر تمہارے ایڈیٹر سودیش مترجی جب بچے کو ہسپتال سے لے کر یہاں آئے تو انہوں نے کہا کہ تم نے بچے کی صورت نہیں دیکھی ہے۔"

"ہاں! مترجی کا خیال تھا کہ بچے کی صورت دیکھ کر میری ممتا تڑپنے لگے گی پھر میں اسے چھوڑنے کا ارادہ بدل دوں گی مگر اب تو جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ اسے دور سے ایک نظر دیکھ کر چلی جاؤں گی۔"

"مگر بیٹی! تم اپنے بچے کو کس طرح پہچانو گی۔ صبح سے اب تک یہاں چار بچے آچکے ہیں ان میں سے ایک لڑکی ہے باقی تین لڑکے ہیں۔ تم اپنے بیٹے کو کیسے پہچانو گی؟"

"آہ! میں یہ سوچنے لگی۔ میں کیسے پہچانوں گی؟ کیا میرا بچہ مجھے دیکھتے ہی پہچان لے گا؟ یہ کیسا احمقانہ خیال ہے؟"

پنڈت گردھاری لال نے کہا۔

"میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ مگر مجبوری ہے تینوں لڑکے ہم رنگ اور ہم عمر ہیں تینوں کا جنم دن پندرہ ستمبر ہے۔"

*

کنٹرول سینٹر کی عمارت کے باہر اخبارات کے رپورٹروں اور فوٹوگرافروں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ کیپٹن ہری رام اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا سگریٹ کے کش پر کش لگا رہا تھا۔ میز کے دوسری طرف فلائنگ کلب کا لائن آفیسر رپورٹ پیش کر رہا تھا۔

"مسٹر! آج پندرہ ستمبر ہے آج کی تاریخ میں دو دن پہلے ہی طیارہ چارٹرڈ کرایا گیا تھا

چارٹرڈ کرانے والے کا نام مہیش چندر چڑجی تھا۔ وہ مہیش اسٹیل مل کے مالک تھے۔"

کیپٹن رام نے پوچھا

"مہیش چندر آج فلائنگ کلب میں کب آئے تھے؟"

"صبح پونے نو بجے۔"

"ان کے ساتھ اور کتنے لوگ تھے؟"

"ان کے ساتھ ان کی دھرم پتنی اور پانچ سال کا ایک لڑکا تھا۔"

"آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ لڑکا پانچ برس کا تھا؟"

"مہیش چندر اس لڑکے کو گود میں اٹھا کر طیارے کی طرف جاتے ہوئے اسے پیار کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ آج وہ اپنے بیٹے کی پانچویں سالگرہ منا رہے ہیں۔"

"ہم۔ ان کا پتہ بتائیے۔"

"وہ کلکتے سے آئے تھے۔ دارجلنگ میں ان کا ایک کاٹیج ہے پتہ ہے تین نمبر روڈ دارجلنگ۔"

اتنے میں سارجنٹ دروازہ کھول کر اندر آیا اور کیپٹن کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"سر ہیلی کاپٹر واپس آگیا ہے۔ اس علاقے کی چٹان کے آس پاس بہت سی چٹانیں ابھری ہوئی ہیں اس لئے وہاں ہیلی کاپٹر لینڈ نہیں ہو سکتا۔ ان کی رپورٹ ہے کہ ہیلی کاپٹر سے کمبل اور کھانے پینے کی چیزیں پھینکی گئی ہیں....."

اس کی بات ادھوری رہ گئی کھلے ہوئے دروازے سے تمام رپورٹر اور فوٹوگرافر دفتر میں گھس آئے تھے اور انہوں نے طرح طرح کے سوالات شروع کر دیئے تھے کیپٹن نے باری باری ہر سوال کا جواب دیا۔

"طیارہ فلائنگ کلب سے چارٹرڈ کیا گیا تھا۔"

"اسٹیل مل کے مالک کروڑپتی مہیش چندر چڑجی گرمیاں گذارنے کیلئے دارجلنگ

تھے۔ اُن کے ساتھ اُن کی دھرم پتنی اور اُن کا بیٹا تھا۔ حادثہ میں ہمیش چندرہ اور اُن کی پتنی ہلاک ہو چکے ہیں۔ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر صرف اُن کے پانچ سالہ بچے کی زندگی کے آثار پائے گئے ہیں۔ آج پندرہ دسمبر ہے اور وہ زندگی اور موت کے درمیان سالگرہ کا دن گزار رہا ہے۔

*

سالن کے جلنے کی بو آئی تو بانو چونک گئی۔ اسے ہوش آیا کہ وہ باورچی خانے میں چولہے کے سامنے کھڑی ہوئی ہے اور تھوڑی دیر بعد کیپٹن سرتاج حسین اپنی سالگرہ منانے اس کے گھر آنے والا ہے۔

سوچ کی رفتار آواز کی رفتار سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔ وہ سوچتے سوچتے پلک جھپکتے ہی دو سال پیچھے آصف کے پاس پہنچ گئی تھی اس کی بیوی بن گئی تھی۔ پھر ایک بچے کو جنم دیکر واپس باورچی خانہ میں آگئی تھی۔ تاکہ سرتاج حسین کیلئے بریانی اور سالن تیار کرسکے۔

تنہائی میں ماضی کی طرف دیکھتے ہی بچے کا خیال دل میں ہوک کے نکلنے لگا تھا۔ دماغ میں طرح طرح کے سوالات ابھرتے تھے " وہ کیسا ہوگا۔ اب پورے دو برس کا ہوگیا ہوگا۔ دو برس کے بچے " اماں اماں " کہنے لگتے ہیں۔

اسی وقت اسے اپنی ماں کی آواز سنائی دی۔

" بانو کیا سوچ رہی ہو؟ کھانا تیار ہوگیا؟ "

" ہاں ابھی ہاں۔ سالن ذرا جل گیا ہے۔ مگر کھانے کے قابل ہے۔ "

" اچھا۔ میں دیکھ لیتی ہوں۔ تم منہ ہاتھ دھوکر لباس بدل لو۔ میں اسے ساتھ لے آئی ہوں وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا ہے۔ "

" کون؟ " بانو نے بے خیالی میں سوال کیا۔ حالانکہ وہ سمجھ رہی تھی۔

" یہ لو کیا تم اتنی جلدی بھول گئیں؟ وہی فوجی افسر اس نے مجھے اپنا نام بتایا ہے

جاتی ہوں اس کا نام سرتاج حسین ہے جلدی جاؤ۔ بیچارہ برسوں سے تنہا زندگی گزار رہا ہے۔ اسے احساس دلاؤ کہ وہ اپنے گھر میں بیٹھا ہے۔

وہ وہاں سے جانے لگی۔ پھر یکبیک پلٹ کر بولی۔

" امی آپ کو تو معلوم ہوگا دو برس کے بچے اماں کہنے لگتے ہیں۔ "

ماں نے بیٹی کو غور سے دیکھا پھر قریب آکر محبت سے اس کے شانہ پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

" بیٹی سبھی بچے اپنی ماؤں کو اماں یا امی کہتے ہی ہیں لیکن تمہارا کوئی بچہ تھا اور نہ ہے۔ میں نے کئی بار سمجھا دیا ہے کہ دو برس پہلے کی باتوں کو مار ڈالو۔ تم نے نیا جنم لیا ہے۔ اگر شادی کی بات چل نکلی تو تم پہلی بار دلہن بنو گی۔ سرتاج تمام راستے تمہاری باتیں کرتا آیا ہے۔ جاؤ وہ انتظار کر رہا ہوگا۔ "

وہ منہ ہاتھ دھونے کیلئے غسل خانہ کی طرف چلی گئی۔ اس کے دل پر عجیب سا بوجھ تھا۔ ماضی ستا رہا تھا اور مستقبل کی مسرتیں اپنی طرف بلا رہی تھیں۔ ماں بار بار سمجھاتی تھی کہ جو پیچھے دیکھ کر چلتے ہیں وہ آگے ٹھوکر کھاتے ہیں وہ بچہ جسے ماں کی بدنصیبی کھا گئی وہ دوبارہ واپس نہیں آئے گا اگر وہ پھر سے سہاگن بنے گی۔ تو پھر اس کے آگے پیچھے بچے ہی بچے ہوں گے۔

ماں اُسے خوشگوار زندگی گزارنے کا سبق پڑھاتی تھی اور یہ بھول جاتی تھی کہ پچھلا سبق ہمیشہ یاد رہتا ہے کوئی بھی تخلیق کار اپنے پہلے فن پارے کو کبھی نہیں بھولتا۔ وہ بچوں کی ماں بننے کے بعد بھی بانو اپنی پہلی تخلیق کو کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔

جب وہ منہ ہاتھ دھونے کے بعد لباس بدل کر آئینے کے سامنے آئی تو کچھ دیر تک اپنے آپ کو دیکھتی رہ گئی۔ آئینے میں جو بانو تھی وہ ان لکھے کاغذ کی طرح تھی۔ جیسے ابھی تک اس پر کسی نے اپنا نام نہیں لکھا تھا۔ اور نہ ہی اس کاغذ پر کبھی کسی بچے کی تصویر بنائی گئی تھی۔ اس نے

تو سرتاج بے اختیار اس کی طرف کھنچتا چلا آیا تھا۔ بانو کو اس کی بات یاد آ گئی۔

"تم چاہو تو مجھے سرتاج کہہ سکتی ہو۔"

وہ آئینے کے سامنے شرما گئی۔ اس نام کے ساتھ ہی شادی کا پیغام تھا۔ سرتاج کا پیار بھرا لہجہ کہہ رہا تھا کہ تمام مرد آصف کی طرح سنگدل اور بے حس نہیں ہوتے۔ وہ پھول کو پھول کی طرح اٹھاتے ہیں اور آخری سانس تک زندگی کے خوبصورت گلدان میں سجا کر رکھتے ہیں

وہ سوچنے لگی۔ ہائے ایسی محبت اور مسرت اب تک کہاں تھی۔ اتنی دیر سے کیوں آئی ہے؟

سوچ کی نگری میں ہمیشہ دیر ہو جاتی ہے اسے احساس ہوا کہ وہ آئینے کے سامنے بڑی دیر سے سوچ میں کھڑی ہے۔ سرتاج ڈرائنگ روم میں تنہا بیٹھا ہو گا۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے سے باہر آئی۔ ڈرائنگ روم کے دروازے تک پہنچ کر اس کی تیز رفتاری برقرار نہ رہی۔ شرم و حیا نے اس کے پاؤں پکڑ لئے۔ وہ دروازے کے ایک پٹ کو تھام کر دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ڈرائنگ روم میں نہیں بلکہ سرتاج کے دل کے کسی گوشے میں قدم رکھنے والی ہے۔

اسی وقت پتہ چلا کہ وہ کمرے میں تنہا نہیں۔ اسے امی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"بیٹا وہ بڑی شرمیلی ہے۔ وہ اس طرح نہیں آئے گی میں اسے بلا کر لاتی ہوں۔"

"نہیں امی! آپ جائیں۔ میں آپ سے ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں مگر ڈر لگتا ہے کہ آپ ناراض ہو جائیں گی۔"

"بیٹے کیسی باتیں کرتے ہو۔ جب تمہیں بیٹا کہا ہے تو تمہاری کسی بات پر ناراض کیسے ہو سکتی ہوں۔ تم بلا جھجک کہو۔"

"امی بات یہ ہے کہ میری شرافت کی گواہی دینے کیلئے میرا کوئی عزیز یا رشتہ دار نہیں ہے۔ اگر آپ مجھے شریف اور ایماندار سمجھتی ہیں تو ۔۔۔ تو بانو کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیں۔ میں اسے اپنی عزت بنا کر ہمیشہ اسی کی عزت کروں گا۔"

اچانک ہی بانو کے کانوں میں شہنائیاں گونجنے لگیں۔

نگاہوں کے سامنے آتش بازیاں چھوٹنے لگیں۔

ایک ماہتابی تیزی سے سرسراتی آسمان کی بلندی کی طرف جانے لگی۔

اس کے ساتھ ہی وقت کا پنچھی تیزی سے پروں کو پھڑپھڑاتا ہوا اڑتا چلا گیا۔

ایک ماہ گذر گیا۔

وہ دلہن کا سرخ جوڑا پہنے۔ گھونگھٹ نکالے سہاگ کی سیج پر بیٹھی تھی۔ گھونگھٹ کے سائے میں ہر کنواری کا دل گھبراتا ہے کہ پتہ نہیں اب کیا ہونے والا ہے لیکن وہ تو کنواری نہیں تھی۔ کلی سے پھول یا لڑکی سے عورت بننے کے بعد کنوارے گھونگھٹ میں چھپ کر بیٹھی تھی۔ کیا پردہ اٹھنے کے بعد بھی وہ اپنے سرتاج سے چھپی رہ سکے گی؟ اگر چھپ نہ سکے اور ماضی کھل کر سامنے آ جائے تو کیا ہو گا؟ کیا دوسری بار طلاق ہو گی؟ یہی سوچ کر اس کا دل گھبرا رہا تھا۔

وہ سہاگن بن کر مسرتوں کے ہجوم میں خوفزدہ تھی۔ بعض اوقات انسان کو ایسے ہی ڈسنے دھمکانے والی خوشیاں ملتی ہیں۔ ایسی خوشیاں خدا نہیں دیتا۔ بلکہ انسان خود خریدتا ہے ایک دوسرے سے لین دین کے موقع پر اگر ایک جانب کچھ دیکر بھی کچھ چھپا لیتی ہے تو بے پناہ مسرتیں حاصل کرنے کے باوجود سہم سہم کر زندگی گزارتی ہے۔

سوچتے سوچتے انتظار کی گھڑیاں ختم ہو گئیں۔ گھونگھٹ کے پیچھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا پھر بھی وہ سمجھ گئی کہ ...... سرتاج حسین سہاگ کے کمرے میں آ گیا ہے اسے سمجھنے کا جو تجربہ تھا وہ تجربات کے مطابق اور زیادہ سمٹ کر بیٹھ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ دنیا کے تمام دولہا آصف کی طرح ایک ہی انداز میں ریکارڈ کی مانند بولتے ہیں اور گھونگھٹ اٹھاتے ہی اپنا قرض وصول کرنے لگتے ہیں لیکن جب سرتاج نے اس کے قریب بیٹھ کر اور اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر بولنا شروع کیا تو بانو کا تجربہ غلط ہو گیا کہ تمام دولہا اپنی خواہشات کو اہمیت دیتے

ہیں اس کے برعکس وہ سہمی ہوئی دلہن کی دلجوئی کرتے ہیں۔ اسے دائمی محبت اور تحفظ کا یقین دلاتے ہیں۔

سرتاج حسین کا انداز ایسا تھا کہ بانو کا دل خود بخود اس کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ اس کے دل و دماغ میں جو خوف سمایا ہوا تھا وہ آپ ہی آپ دور ہو گیا۔ بعض مرد ساحر ہوتے ہیں اس لئے تو وہ سحر زدہ ہو گئی تھی۔ اُسے معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کب اور کیسے اپنے سرتاج کی آغوش میں چلی گئی۔ تب سرتاج نے کہا۔

"آج سے تم مجھ میں ہو اور میں تم میں ہوں ان حسین لمحات کے بعد ہمارے درمیان کوئی پردہ نہیں رہے گا میں پہلے ہی تمہیں بتا چکا ہوں کہ تم سے پہلے میری زندگی میں دو لڑکیاں آچکی ہیں۔ اگر تمہاری زندگی میں مجھ سے پہلے کوئی آیا ہو تو مجھ سے نہ چھپاؤ ......"

بانو کے دل کی دھڑکنیں ایک دم سے تیز ہو گئیں۔ جو خوف مٹ گیا تھا وہ یکبارگی اس کے اندر زلزلے کے سے جھٹکے پہنچانے لگا۔ وہ ہزار ضبط کے باوجود کانپنے لگی۔ وہ اپنی دانست میں اپنی کوئی کمزوری ظاہر نہیں کر رہی تھی لیکن بعض باتوں کا ردِ عمل بے اختیار ہوتا ہے اس پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔ سرتاج چند لمحوں تک انتظار کرتا رہا کہ شاید وہ جواباً کچھ بولے گی پھر وہ خود ہی بولا۔

"تم لرز رہی ہو۔ میں سمجھ گیا۔ میں پہلا شخص ہوں جو تمہاری زندگی میں آیا ہوں۔ یہ تمہارے بدن کی کنواری کپکپاہٹ ہے میں سمجھ گیا۔ بالکل سمجھ گیا ......"

بانو کو یوں لگا جیسے وہ طنز کر رہا ہے مگر وہ تو پیار کر رہا تھا اس کی سانسوں کے راستے دل میں اتر رہا تھا جس بات کا جواب وہ نہ دے سکی تھی۔ سرتاج اس بات کو اس کی اداؤں میں ڈھونڈ رہا تھا۔ کوئی ضروری نہیں تھا کہ سرتاج سراغ رساں بن گیا ہو۔ بانو کے دل کا چور ایسا سوچ رہا تھا۔ حالانکہ سب ہی شوہر اپنے حقوق کے مطابق ایسے وقت سراغ رساں بن کر پیار سے تفتیش کرتے ہیں۔

کمرے میں گہری تاریکی تھی۔ اس تاریکی میں وہ اپنے آپ کو بھی نہیں دیکھ سکتی تھی اس لمحے کچھ احساسات تھے کہ وہ آپریشن تھیٹر کے بیڈ پر پڑی ہوئی ہے۔ اسے جھوٹ کا سرطان ہو گیا ہے اور سچائی کے نشتر سے اس کا آپریشن کیا جا رہا ہے کیا واقعی دنیا میں کوئی ایسا ہسپتال ہے جہاں سے جھوٹ کی میڈیکل رپورٹ حاصل کی جا سکتی ہو؟

"نہیں" بانو نے بڑے حوصلے سے سوچا۔ "کوئی میرے جھوٹ کو نہیں پکڑ سکتا اس کے باوجود میں نے فیصلہ کیا تھا کہ محبت کرنے والا شوہر ملے گا تو اس سے کچھ نہیں چھپاؤں گی مگر امی نے مجھے اس بچے کی قسم دی ہے جو ابھی نہیں ہے اور ہے! انہوں نے التجا کی ہے کہ اب میں کسی پر اعتماد نہ کروں۔ سرتاج خواہ کتنا ہی شریف، ایماندار اور محبت کرنے والا شوہر ہو وہ ایک باسی دلہن کو کبھی برداشت نہیں کرے گا۔"

وہ بڑی قیامت کی رات تھی۔ گناہ بھی نہیں چاہتی تھی اندیشے تھے کہ دل میں گھر کر رہے تھے اور اس کے چاروں طرف کی تاریکی اُسے دلاسے دے رہی تھی کہ اسے پریشان نہیں ہونا چاہیئے۔ رات کی تاریکی میں اور ماں کے پیٹ میں ہر بات چھپ جاتی ہے۔

رات کے پچھلے پہر سرتاج اٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا۔ پھر اس کے پٹ کھولنے کے بعد ایک سگریٹ سلگانے لگا۔ بانو نے چپکے چپکے کروٹ بدل کر اس کی جانب دیکھا۔ کھڑکی کے باہر تاروں بھرے آسمان کے پس منظر میں وہ ایک سائے کی طرح نظر آ رہا تھا اس کی پشت بانو کی طرف تھی تھوڑی سی دیر تک دونوں کے درمیان بڑی پُراسرار سی خاموشی رہی۔ پھر وہ ایک سگریٹ کا ایک کش لگا کر دھواں چھوڑنے کے بعد ہنسنے لگا۔

وہ کس پر ہنس رہا تھا۔ بانو پر یا اپنے آپ پر؟ ہنسنے کی کوئی وجہ تو ہو گی۔ بغیر کسی وجہ کے صرف پاگل ہنستے ہیں۔

"میں بھی کیسا نادان ہوں کہ اپنے سامنے کے ہر انسان سے یہ توقع کرتا ہوں کہ وہ پوری سچائی سے میرے سامنے آئے یہ سراسر حماقت ہے ہر انسان کا اپنا ایک ماضی

اپنے چند راز اور اپنا غرور ہوتا ہے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اُس کے ذاتی معاملات کی چھان بین کرے۔"

اس نے پھر سگریٹ کا ایک کش لے لیا۔ اندھیرے میں سگریٹ کی آگ دہکنے لگی بانو کو یوں لگا جیسے وہ اس کے سلگتے ہوئے دل کو پھونک رہا ہو۔ آخر اس نے کہا۔

"بانو! میں یہ نہیں سمجھا کہ تم نے مجھ سے کچھ چھپایا ہے اگر چھپایا ہے تو پھر چھپا کر رکھنا۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہاری انانیت کو ٹھیس نہ پہنچے۔ تم میری عزت ہو اور تمہاری عزت رکھنا میرا فرض ہے۔"

بانو اس کی محبت اور شرافت کا یہ انداز دیکھ کر تڑپ گئی اس کے جی میں آیا کہ وہ ابھی جا کر اس کے قدموں سے لپٹ جائے اور اپنے ماضی کی ایک ایک بات اسے بتا دے مگر وہ کون سی بات؟

وہ تو سوچ رہا ہوگا کہ اس کی دلہن کی زندگی میں پہلے بھی کوئی آ چکا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ اسے کنواری نہیں سمجھ رہا ہوگا۔ لیکن اتنی دور تک نہیں سوچ سکا کہ وہ ایک بچے کی ماں بھی بن چکی ہے۔ درست ہے کہ عورت سرتاج جیسے شوہر پر اپنی جان بھی قربان کر دیتی ہے مگر عورت کی جو انا ہوتی ہے اسے ٹھیس نہیں پہنچاتی۔ اپنے دل کی بات خود کبھی زبان کی نوک تک نہیں لاتی۔ بانو کے ساتھ بھی یہی عورت کی مجبوری تھی جسے وہ خود سمجھ سکتی تھی۔ اپنے ضمیر کو نہیں سمجھا سکتی تھی۔

وہ قیامت کی رات کسی طرح گذر ہی گئی دوسری صبح ناشتہ کی میز پر ماں موجود تھی اور بڑی خاموشی سے بیٹی اور داماد کے چہروں کو پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی سرتاج اپنی عادت کے مطابق ہنس بول رہا تھا۔ بانو کچھ چپ چپ سی تھی لیکن سرتاج کی کسی بات پر شرما کر مسکرا دیتی تھی۔ ماں کو اطمینان ہو گیا کہ بات بن گئی ہے۔ جب داماد خوش ہے تو بانو کی قسمت بھی خوش ہے بانو تو اپنی عادت سے مجبور ہو کر چپ چپ سی رہتی ہے۔

پھر دن، ہفتے اور مہینے گذرنے لگے۔ سرتاج نے پھر کوئی ایسی بات نہیں چھیڑی جو بانو کے دل پر بوجھ بن جاتی۔ وہ تو پہلے دن سے ہی اس کا دیوانہ بن گیا تھا اس کی دیوانگی بدستور قائم تھی مشکل یہ ہے کہ انسان کو کسی کروٹ قرار نہیں ملتا۔ بانو کے دل سے خوف اور اندیشے دور ہوئے تو وہ سرتاج کی دیوانہ وار محبت سے گھبرانے لگی۔ وہ اپنے خلوص اور محبت سے عظمت حاصل کر رہا تھا اور وہ تھی کہ آپ اپنی ہی نظروں سے گرتی جا رہی تھی۔

ایک سال بعد سرتاج نے اس کے لئے دو بیڈ روم اور ایک ڈرائنگ روم کا چھوٹا سا مکان بنایا اور اس کے ہاتھ میں مکان کی چابی دے کر کہا۔

"یہ تمہارا گھر ہے اس کا دروازہ اپنے ہاتھوں سے کھولو۔ اور اپنی محبت سے اس گھر کو جنت بنا دو۔"

اپنے مکان کا پہلا دروازہ کھولتے وقت بانو کے ہاتھ کانپ رہے تھے ایک وہ آصف تھا جو گھر لوٹ کر چلا گیا تھا۔ ایک یہ سرتاج تھا جس نے اپنی محنت کے گاڑھے پسینے سے محبت کا "وہ چھوٹا سا تاج محل" بنایا تھا۔ کیا وہ اس گھر کو اس کے لئے جنت بنا سکتی تھی؟ مگر کیسے بنا سکتی تھی اس نئے گھر میں داخل ہوتے ہی پہلا خیال اس کے دل میں یہی آیا کہ اگر وہ بچہ آصف کا نہ ہوتا، سرتاج کا ہوتا تو وہ اسے بانہوں میں لے کر اس نئے مکان میں قدم رکھتی۔ پھر اس کے اور سرتاج کے درمیان کوئی جھوٹ اور بے اعتمادی نہ ہوتی۔

جب دو برس گذر گئے تو سرتاج نے ایک رات اسے بازوؤں میں سمیٹ کر پوچھا۔

"کیا بات ہے کیا ہمارے اس چھوٹے سے گھر میں ایک ننھا سا پھول نہیں کھلے گا؟"

بانو اس کے سینے پر سر رکھتے ہوئے بولی۔

"میں کیا کہوں۔ یہ تو خدا کی دین ہے، وہ جب چاہے، گود میں پھول کھلا دے۔"

ایسا کہتے وقت اس کا حلق خشک ہو گیا۔ اس کی نظروں کے سامنے دیوار سے

لگے ہوئے کیلنڈر پر گئی کیلنڈر پندرہ ستمبر کی تاریخ بتا رہا تھا اس کا دل جیسے حلق میں آکر دھڑکنے لگا۔

"اوہ خدایا! اب تو میرا لعل چار برس کا ہو گیا ہوگا۔ وہ ابھی کیا کر رہا ہوگا؟"

ایسے وقت شوہر سے وفا کرتے کرتے ایک شخص سی دیوار حائل ہو جاتی تھی۔ مگر بچہ نگاہوں کے سامنے ہو تو اسے چھوڑ کر شوہر کے سینے سے لگا جا سکتی ہے مگر نگاہوں سے اوجھل ہو تو ازدواجی محبت کے درمیان وہ عورت کو بیوی کے بدلے صرف ماں بنا کر رکھ دیتا ہے۔ بانو کو یہ ممتا بڑی مہنگی پڑ رہی تھی۔

ایک برس اور گذر گیا۔ پندرہ ستمبر کی صبح بانو کی آنکھ کھلی تو اسے سب سے پہلے یاد آیا کہ بیٹے سے بچھڑے ہوئے پانچ سال گذر چکے ہیں اگر وہ آج موجود ہوتا تو صبح ہی سے اس کی پانچویں سالگرہ کی تیاری شروع ہو جاتی۔ محلے کے بچوں کو مدعو کیا جاتا۔ گانے بجانے کا پروگرام ہوتا۔ میرا بیٹا تمام بچوں کے درمیان شہزادہ نظر آتا۔ کیسا ہنگامہ ہوتا۔ یہ گھر خوشیوں سے بھر جاتا۔

اس کی نظر گھڑی پر گئی تو نو بج گئے تھے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اب اسے سرتاج کا خیال آیا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ صبح دیر تک سوتی رہتی تھی اور سرتاج ناشتے کے بغیر ڈیوٹی پر چلا جاتا تھا وہ بستر سے اٹھ کر اپنی کوتاہیوں کا احساس کرتی ہوئی مکان سے باہر لان میں آئی۔ اس خیال سے کہ شاید وہ ابھی لان میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا ہو۔ مگر وہ نہیں تھا۔ ٹھیک نو بج کر دس منٹ پر اسے ایک طیارے کی آواز سنائی دی۔ وہ سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ چھوٹا سا طیارہ زندگی کے ایئرپورٹ سے پرواز کرتا آیا ہے اور موت کے رن وے پر لینڈ کرنے والا ہے۔

اس کے دل نے دھڑک دھڑک کر یہ نہیں بتایا کہ اس طیارے میں ایک پانچ برس کا ننھا سا مسافر اپنی پانچویں سالگرہ منا رہا ہے۔

وہ جیسے پانچ برس کا ایک ایک لمحہ ایک کانٹے کی طرح چبھتا رہا تھا۔ اس کے خون میں اُبال نہیں آیا کہ اس کے خون کا ایک چھینٹا اس کی نگاہوں کے سامنے سے پرواز کرتا گزر رہا ہے۔

ہاں! اچانک ہی اس کے دل میں درد سا محسوس ہوا۔ وہ سمجھ سکی کہ یہ درد کون سے چور دروازے سے آیا ہے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سینے کو تھام کر مکان کے اندر چلی گئی۔

*

خبریں عموماً اخبارات سے پہلے ریڈیو پر نشر ہو جاتی ہیں۔ دیس کے تمام ریڈیو اسٹیشن پانچ سالہ جانی کے متعلق خبریں سنا رہے تھے۔ طیاروں کو حادثات پیش آتے رہتے ہیں حادثات میں مرنے والوں پر افسوس بھی کیا جاتا ہے پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان حادثات کو بھلا دیا جاتا ہے لیکن یہ خبر سن کر ہر ماں باپ کا دل دہل گیا کہ ایک پانچ برس کا بچہ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر بے یار و مددگار پڑا ہے یہ خبر سن کر کوئی ماں ایسی نہیں تھی جس نے اپنے بچے کو فوراً ہی کھینچ کر سینے سے نہ لگا لیا ہو۔

ڈیلی ایوننگ ٹیلی گرام کے ایڈیٹر نے ریڈیو سوئچ کو آف کرتے ہوئے اپنے رپورٹر ڈاس ڈیو سے کہا۔

"ڈاس ڈیو! اپنے فوٹوگرافر کے ساتھ فوراً ڈارلنگ پہنچو۔ وہاں پہنچ کر جانی کی کاٹج کی تصویر لو۔ کاٹج کے اندر پہنچ کر اس بچے کے خالی بستر کی بھی ایک تصویر اتارو۔ وہاں جو لوگ ہوں ان کے بیانات لے کر ایک معصوم بچے کے متعلق ایسی لرزہ خیز کہانی بناؤ کہ پڑھنے والوں کے دل دہل جائیں۔ یہ سنہری موقع ہے ہمارے اخبار کی اشاعت بڑھ جائے گی۔"

"میں سمجھ رہا ہوں باس! جب دھماکہ خیز خبریں شائع نہ ہوں۔ اخبار ہاتھوں ہاتھ نہیں بکتا......"

ایڈیٹر نے کہا "صرف دھماکہ خیز ہی باتوں سے کام نہیں چلتا۔ ان خبروں میں نمک

مرچ اور دوسرے مسالے لگانے پڑتے ہیں۔ مثلاً ہم جانی کے خالی بستر کی ایک تصویر شائع کریں گے اور اس کے نیچے لکھیں گے کہ اس آرام دہ بستر پر ماں کی لوریاں سننے والا جانی بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر پتھریلی چٹانوں کی گود میں پڑا ہے جہاں سے دیس کی کوئی ماں اپنی لوری کی آواز اس کے کانوں تک نہیں پہنچا سکتی ..... کہو یہ کیسا نیوز اسٹنٹ ہوگا؟"

"غضب ہو جائے گا باس! ایسی باتیں پڑھ کر تمام مائیں چیخنے لگیں گی۔"

"یہی تو پوائنٹ ہے جب عورتیں چیخیں گی اور ضد کریں گی تو اُن کے پتی یا پتا اخبار خریدنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ بس اب جلدی سے جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ روزنامہ سندیش کی میریا تم سے پہلے وہاں پہنچ جائے۔ کوشش کرو کہ وہ شیطان کی خالہ تم سے پہلے کوئی خاص معلومات حاصل نہ کر سکے۔"

"ایسا ہی ہوگا باس! وہ کتنی ہی چالاک ہو مجھ سے بازی نہیں لے سکے گی۔"

ایسا ہی ہوا سب سے پہلے داس دیو اپنے فوٹوگرافر کو لیکر دارجلنگ پہنچ گیا۔ جانی کا کاٹیج ایک پہاڑی کے دامن میں تھا جب داس دیو کاٹیج کے احاطے میں داخل ہونے لگا تو مالی نے احاطہ کا دروازہ کھولا اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور آنکھیں روتے روتے سوج گئی تھیں۔ داس نے اس سے پوچھا۔

"تم یہاں کام کرتے ہو؟"

"ہاں صاحب! میں یہاں کا مالی ہوں مگر آج یہاں کی پھلواری اجڑ گئی ہے۔"

"واہ واہ کیا دل کو لگنے والی بات کہی ہے۔ ٹھہرو میں اسے لکھ لیتا ہوں۔"

اس نے نوٹ بک میں لکھنے کے بعد کہا۔

"تم اس کھمبے سے ٹیک لگا کر آسمان کی طرف یوں حسرت بھری نظروں سے دیکھو۔ جیسے یہ آسمان جانی کے جانے کے بغیر ننگا ہو گیا ہو۔ ہم تمہاری یہ تصویر اخبار میں چھاپیں گے۔"

پھر اس نے اپنے فوٹوگرافر سے کہا کہ وہ تصویر اتارنے کے لئے تیار ہو جائے۔ اسی

وقت میریا کی آواز سن کر چونک گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ بلاشبہ کورکا بلاؤز اور اسکرٹ پہنے اپنے شانے سے ایک کیمرہ لٹکائے کھڑی تھی اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"مسٹر داس دیو۔ ایک مالی کو اداکار بنانے سے تمہارے اخبار کی مانگ نہیں بڑھے گی صحافت کے پیشے کو مذاق نہ بناؤ۔"

داس دیو نے بات ٹالنے کے لئے مسکرا کر کہا۔

"اچھا تو تم پہنچ گئیں۔ مگر کیا بات ہے آج تم پھول کی طرح کھلی لگ رہی ہو۔ جبکہ اس بچے کی ٹریجڈی ماؤں کو اداس کر سکتی ہے اور تم تو ابھی کنواری ہو۔"

میریا کے دل کو ایک دھچکا سا لگا کہ وہ کنواری مریم ہے کوئی اس کی ممتا کو نہیں سمجھ سکتا جب سے اس پانچ سالہ جانی کی خبر سنی تھی اس کا دل بے طرح گھبرا رہا تھا۔ وہ اپنے بچے کی عمر کا حساب کر چکی تھی۔ اگرچہ وہ نہیں جانتی تھی کہ جانی وہی بچہ ہے وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایک کروڑپتی سیٹھ کا بچہ اس کے اپنے خون کا پردہ ہو سکتا ہے وہ تو محض ایک بچے کا درد اپنے دل میں لے کر وہاں آئی تھی اور اپنے روزنامہ کے لئے صحیح خبریں حاصل کرنا چاہتی تھی۔

وہ کوئی جواب دیئے بغیر کاٹیج کے دروازے کی طرف جانے لگی۔ داس دیو اس سے پہلے تیزی سے چلتا ہوا کال بیل تک پہنچ گیا۔ پھر اس کا بٹن دبانے کے بعد بولا۔

"میریا! یہاں کوئی تیسرا اخبار رپورٹر نہیں ہے آؤ ہم دونوں آپس میں سمجھوتہ کر لیتے ہیں یہاں سے جو معلومات حاصل ہوں گی وہ معلومات ہم آپس میں بانٹ لیں۔ جن معلومات کا جو حصہ میں شائع کروں گا وہ تم نہیں کرو گی اور جو حصہ تم شائع کرو گی وہ میں نہیں کروں گا۔"

میریا نے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھ کر کہا۔

"مجھے منظور ہے۔ لیڈیز فرسٹ کے اصول کے مطابق پہلے میں کہتی ہوں کہ جانی کی تصویر میرے اخبار میں شائع ہوگی۔ سمجھوتے کے مطابق تم اس کی تصویر شائع نہیں کرو گے۔"

داس دیو نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"اوہ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جانی تو اہم موضوع ہے اس کی تصویر تمام اخبارات شائع کریں گے۔"

میریا نے کہا۔ "اس طرح جانی کے متعلق جتنی خبریں ہوں گی وہ سب ہی اہم ہوں گی لہٰذا فضول سمجھتے بازی سے پرہیز کرو۔"

اتنے میں دروازہ کھل گیا۔ ایک بوڑھی ملازمہ نے ساڑھی کے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کون لوگ ہیں؟"

داس دیو نے اپنے فوٹو گرافر سے کہا کہ آنسو پونچھتی ہوئی اس عورت کی فوراً تصویر اتاری جائے۔ فوٹو گرافر نے کیمرے کی آنکھ سے دیکھا۔ اسی وقت میریا اس بوڑھی عورت کے بالکل قریب آکر اپنے رومال سے اس کے آنسو پونچھنے لگی۔ کیمرے کا بٹن دبنے کے بعد فوٹو گرافر کو پتہ چلا کہ میریا بھی تصویر میں چلی آئی ہے۔

داس دیو نے جھلا کر کہا۔

"یہ کیا حرکت ہے کیا ابھی آنسو پونچھنا ضروری تھا؟"

"ہاں! داس دیو۔ ہم پہلے انسان ہیں بعد میں رپورٹر ہیں ایک دکھی عورت کے آنسو پونچھ کر اسے تسلی دینے کے بعد ہم اپنا کام کر سکتے ہیں۔"

بوڑھی ملازمہ نے اس سے متاثر ہو کر کہا۔

"بیٹی! تم بہت اچھی ہو۔ عورت ہی عورت کے دکھ درد کو سمجھتی ہے۔ آؤ، اندر آ جاؤ۔"

داس دیو ان سے پہلے ہی کمرے میں پہنچ گیا۔ اس نے پوچھا۔

"ماں جی! آپ کا بچے کے ساتھ کیا رشتہ ہے؟"

"میں اس گھر کی ملازمہ ہوں۔ مگر ایک ماں کی طرح دن رات جانی کو گود میں کھلایا ہے میں ان کا انتظار کر رہی تھی کہ وہ جانی کو ہوائی جہاز کی سیر کرانے کے بعد آتے ہی ہوں گے اس وقت

میں نے ریڈیو لگایا تو یہ منحوس خبر سنائی دی۔ اپنے کانوں سے سن کر بھی یقین نہیں آ رہا ہے۔ بیٹی! یہ خبر جھوٹی نہیں ہو سکتی؟"

"نہیں ماں جی!" میریا نے کہا۔ "یہ خبر جھوٹی ہوتی تو ہم یہاں نہ آتے۔ آپ پیار کر کے جانی کی ایک تصویر ہمیں دے دیں۔ کیا آج جانی کی سالگرہ منائی جا رہی تھی؟"

"ہاں، یہ دیکھو۔ کل رات ہی یہ بڑا برتھ ڈے کیک منگوایا گیا تھا۔"

ملازمہ نے آگے بڑھ کر ایک میز پر سے کپڑے کو ہٹایا۔ وہاں ایک بڑا سا برتھ ڈے کیک رکھا ہوا تھا۔ فوٹو گرافر اس کی تصویر اتارنے لگا خوب صورت سے کیک پر واضح الفاظ میں "پندرہ ستمبر" لکھا ہوا تھا۔ میریا سالگرہ والی بات جانتی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ آج کونسی تاریخ ہے لیکن کیک پر "پندرہ ستمبر" کی تحریر دیکھ کر اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اس کے دماغ کی کوکھ میں اس کا بچہ مچل مچل کر پوچھنے لگا۔

"ممی! آپ میری سالگرہ نہیں منائیں گی؟ دیکھئے نا؟ میرا برتھ ڈے کیک تیار ہے۔ بولئے نا۔ کیا آپ میری سالگرہ نہیں منائیں گی؟"

ایک بچہ اندر ہی اندر اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اب پیدا ہونے والا ہے اس نے اپنے آپ کو ٹٹولا کیا ہو سکتا ہے؟ پانچ برس پہلے تو وہ اندر سے مر چکی تھی۔ مرنے کے بعد اندر کون سا ایسا ہے جو اسے رلا سکتا ہے؟

انسان جو سوچ بھی نہیں سکتا وہی اس کے آگے آتا ہے وہ چپ چاپ کھڑی کیک پر لکھی ہوئی تاریخ کو تکتے جا رہی تھی۔

"میں بارہ سال سے ملازمت کر رہی ہوں۔ پانچ برس پہلے میں سیٹھ اور سیٹھانی کے ساتھ خود جانی کو لانے گئی تھی۔"

"لانے گئی تھیں؟" داس دیو نے ذرا تعجب سے پوچھا۔

"یعنی آپ ہسپتال یا میٹرنٹی ہوم سے اسے لانے گئی تھیں؟"

"وہ آں؟" ملازمہ ایک ذرا ہچکچانے لگی۔ اور اپنے دونوں بازوؤں کو گود لینے کے انداز میں یوں تکنے لگی جیسے بچے کو اٹھائے بہت دور سے لا رہی ہو۔ پھر وہ حسب عادت بڑبڑانے لگی۔

"اس کے پالنے والے تو سورگ باسی ہو گئے اب یہ بتانے سے کیا فرق پڑے گا کہ وہ ہسپتال سے لایا گیا تھا۔ یا آشرم سے ۔۔۔۔"

یہ بات میریا کے سینے میں گولی کی طرح لگی وہ ایک دم سے لڑکھڑا کر صوفے پر گر پڑی۔ اس سے بے خبر داس دیو نے چٹکی بجا کر کہا۔

"وہ مارا۔ یہ خبر بڑی دھماکہ خیز ہو گی کہ وہ بچہ لے پالک ہے۔ اگرچہ حادثہ میں اس کا باپ اور اس کی ماں مر چکی ہے اس کے بعد بھی اسے جنم دینے والی ماں کہیں زندہ ہو گی۔ اُف! اس خبر سے کیسی سنسنی پھیل جائے گی۔"

مگر کیسی سنسنی اور کیسے کرب سے گزر رہی تھی۔ یہ میریا کا چہرہ بتا رہا تھا اس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ "میرا بچہ ۔۔۔ میرا بچہ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر بے یار و مددگار پڑا ہوا ہے۔ میں ابھی جاؤں گی۔ ساری بلندیوں کو گرا کر اسے سینے سے لگا لوں گی۔"

وہ تھرتھراتی ہوئی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اسی وقت داس دیو نے کہا۔

"میریا! میں تم سے زیادہ فاسٹ ہوں۔ دیکھ لینا یہ خبر سب سے پہلے میرے اخبار میں آئے گی۔" پھر اس نے ملازمہ سے پوچھا۔ "جانی کو کس آشرم سے لایا گیا تھا؟"

"وہ جلپائی گوڑی کے بالک آشرم سے ۔۔۔۔"

ملازمہ کی بات سن کر میریا کو مکمل یقین ہو گیا کہ وہ بچہ اسی کا ہے اس نے داس دیو کا بازو تھام کر کہا۔

"ٹھہرو۔ داس دیو! میری ایک بات مان لو۔ ہم میں سے کسی کو یہ خبر شائع

نہیں کرنی چاہیئے کہ وہ بچہ لے پالک ہے۔"

"کیوں؟" داس دیو نے بھنویں سکیڑ کر پوچھا۔

"اس لیے کہ وہ بچہ ایک کروڑ پتی سیٹھ مہیش چندر کے نام سے پہچانا جاتا ہے اگر تم یہ خبر شائع کرو گے تو اس معصوم بچے سے ایک باپ کا نام چھن جائے گا۔ انڈسٹریلسٹس میں اس کا تمام کیریئر تباہ ہو جائے گا۔"

"میریا! مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش نہ کرو۔ تم یہ خبر میرے پاس روک کر خود اپنے اخبار میں شائع کرو گی۔ اپنی یہ چالاکی اپنے ہی پاس رکھو۔"

وہ تیزی سے چلتا ہوا باہر جانے لگا۔ میریا نے اسے آواز دی۔ داس دیو نے دروازے سے پلٹ کر میریا کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے فوٹوگرافر سے کہا کہ وہ اس گھر سے جانی کی ایک تصویر حاصل کرے۔ پھر اس نے بوڑھی ملازمہ سے پوچھا۔

"ماں جی! مجھے یقین ہے کہ آپ جانی کی اصلی ۔۔۔ ماں کو جانتی ہیں کیا آپ مجھے اس کا پتہ بتائیں گی؟"

میریا نے جلدی سے کہا۔

"ماں جی کچھ نہیں ۔۔۔۔ جانتیں۔ یہ کچھ نہیں بتائیں گی۔"

بوڑھی عورت نے تائید کی۔ "یہ سچ ہے بیٹا! آشرم والوں نے جانی کے ماں باپ کا پتہ بتانے سے انکار کر دیا تھا۔"

"میں اچھی طرح سمجھتا ہوں میریا! ماں جی کو تمہارا اشارہ مل گیا ہے لیکن میں نے بھی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ میں آشرم سے معلومات حاصل کروں گا۔"

یہ کہتے ہی وہ کوئی جواب سنے بغیر کاٹیج سے باہر آ گیا۔ ڈاک خانہ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا وہاں پہنچا۔ پھر ٹرنک کال کے ذریعے اپنے ایڈیٹر سے باتیں کرنے لگا۔ اس نے ایڈیٹر کو بتایا کہ وہ میریا کے مقابلے میں کتنی

itsurdu.blogspot.com

تیز رفتاری اور ذہانت سے کام کر رہا ہے۔ فوٹوگرافر شام تک اہم تصویریں لے کر دفتر پہنچ جائے گا۔ اس نے وہ دھماکہ خیز خبر بھی سنا دی کہ جانی بے بالک لڑکا ہے اور اب وہ آشرم کی طرف جا رہا ہے تاکہ جانی کی اصل ماں کا سراغ لگا سکے۔

یہ تفصیلی رپورٹ دینے کے بعد وہ ریلوے اسٹیشن آیا وہاں سے نیرو گیج کے ذریعہ سلی گوڑی پہنچا۔ سلی گوڑی سے براڈ گیج کے ذریعہ جلپائی گوڑی پہنچ کر اس نے آشرم کا پتہ معلوم کیا۔ پندرہ منٹ کے بعد جب وہ سائیکل رکشا میں بیٹھ کر آشرم میں آیا تو دفتر میں قدم رکھتے ہی ٹھٹک گیا اس کا سارا جوش و خروش سرد پڑ گیا۔ میریا اس سے پہلے ہی وہاں پہنچ کر پنڈت گردھاری لال سے باتیں کر رہی تھی۔ اس نے داس دیو کو دیکھتے ہی کہا۔

"داس دیو! میں نے تمہیں سمجھایا تھا کہ ایک معصوم اور مظلوم بچے کا کیریر تباہ نہ کرو۔ کسی ماں پر کیچڑ نہ اچھالو۔ کیا تمہاری کوئی ماں نہیں ہے؟"

"فضول باتیں نہ کرو میریا! میری ماں ایک آدرش ناری ہے۔"

"تو پھر اس آدرش ناری سے جا کر ـــ پوچھو کہ وہ تمہارے جیسے سپوت کو کسی عورت ذات کی توہین کرنے کی اجازت دے سکتی ہیں یا نہیں؟ اپنا نام کرنے اور اپنا اخبار بیچنے کیلئے آدمی کو اتنا نہیں گرنا چاہیئے۔"

داس دیو نے ناگواری سے دیکھتے ہوئے پنڈت جی کو مخاطب کیا۔

"شریمان! آپ دھرم کی بات کریں۔ ایک بے بالک بچہ جو اپنے ماں باپ سے محروم ہو چکا ہے۔ اس بچے کو اس کی اصلی ماں تک پہنچانا کیا ہمارا کرتویہ (فرض) نہیں ہے؟"

"ہاں بیٹے!" پنڈت جی نے کہا۔ "مجھے خوشی ہے کہ تمہارے جیسے نوجوان اپنے کرتویہ کو سمجھتے ہیں لیکن تم اس آشرم کے دستور کو نہیں جانتے۔ یہاں جو بچے آتے ہیں ان کی ماؤں کے نام کسی کھاتے میں لکھ کر نہیں رکھے جاتے کیونکہ ایسی ماؤں سے اولاد کا رشتہ ہمیشہ کے

لئے ٹوٹ جاتا ہے اور جو چیز ٹوٹ جاتی ہے اسے سنبھال کر نہیں رکھا جاتا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" داس دیو نے کہا۔ "ہم آپ جب دفتر کھول کر بیٹھتے ہیں تو چھوٹی سے چھوٹی چیز کا حساب لکھتے ہیں پھر کیسے یقین کیا جا سکتا ہے کہ ماں لونے کا حساب یہاں نہیں رکھا جاتا ہے۔"

"میرے بیٹے ان باتوں کو سمجھنے کے لئے ایک عمر چاہیئے اس دنیا میں چھوٹے سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیزوں کی گنتی ہو جاتی ہے مگر آدمی اپنے لہو کی بوند کا حساب نہیں رکھتا۔ ایسے ہی لہو کے چھینٹے اس آشرم میں آتے ہیں۔ اگر مرد اپنے پاپ (گناہ) سے انکار نہ کرے تو کوئی عورت اپنے بچے کو یہاں نہ لائے اب اگر میں برتی جاؤں تو بات بہت دور تک جائے گی۔"

"آپ مجھے ٹالنے کیلئے یہ سب کچھ کہہ رہے ہیں۔"

"بیٹے جو سچ تھا وہ میں نے کہہ دیا۔"

"نہیں شریمان! میں بچہ نہیں ہوں کہ بہل جاؤں۔ میریا نے عورت ذات کی لاج رکھنے کی پرارتھنا کی ہوگی۔ اس لئے آپ مجھے اس بچے کی ماں کا نام اور پتہ نہیں بتائیں گے لیکن میں ہار ماننے والا آدمی نہیں ہوں۔ جب یہ خبر میرے اخبار میں چھپے گی کہ پہاڑ کی چوٹی پر جو بچہ ہے وہ پندرہ ستمبر کو پیدا ہوا تھا اور جلپائی گوڑی کے بالک آشرم سے مہیش چندر اور ان کی پتنی کی گود میں پہنچا تھا تو جانتے ہیں کیا ہوگا؟ وہی ہوگا جو میں چاہتا ہوں۔ اس بچے کی اصل ماں جہاں بھی ہوگی، وہ اخبار پڑھتے ہی سات پردوں سے نکل کر اپنے بچے کی طرف بھاگے گی ـــ اونہہ، میرا نام داس دیو ہے۔ داس دیو...."

وہ بڑے گھمنڈ سے پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ میریا نے مایوسی سے کہا۔

"یہ نہیں مانے گا۔ اس کی نادانی سے ان دو ماؤں تک یہ خبر پہنچ جائے گی۔ یہ میں جانتی ہوں کہ ان کے دلوں پر کیا گذرے گی۔ میرے اندر تو ایسی تڑپ اور بے چینی ہے

کریں پنگھٹ دیکھ کر پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھ جایا کرتی ہوں۔"

"دھیرج رکھو بیٹی! بھگوان سے بچے کے لئے پرارتھنا کرو۔ وہ تم تینوں عورتوں کی لاج بھی رکھے گا۔ پتہ نہیں وہ دو عورتیں کہاں ہیں۔ ان میں سے ایک نے اپنے بچے کو آشرم کے دروازے پر چھوڑ دیا تھا یعنی اپنے آپ کو چھپایا تھا مگر اب بچے کی پیاس کر وہ چھپی نہ رہ سکے گی۔"

"دوسری کو میں پہچانتی ہوں۔ اس کا نام یشو رانی ہے..."

*

یشو رانی جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے کھڑی ہوئی خلاء میں ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔ یہ انسان کی بہت پرانی عادت ہے کہ جب وہ اپنے اندر جھانکتا ہے تو بے اختیار خلاء میں گھورنے لگتا ہے۔ اسی طرح یشو رانی خلاء میں گھورتی ہوئی جیل کی آہنی سلاخوں سے نکل کر ماضی کے اس دور میں پہنچ گئی تھی جب وہ کنواری کنیا کہلاتی تھی۔

ماتا پتا نے اس کا نام یشودھا رکھا تھا۔ بھگوان کرشن کنہیا کو جنم دینے والی ناری کا نام بھی یشودھا تھا۔ اس ناطے سے یشو رانی کے ماں باپ نے اپنی بیٹی کو پوتر اور بھاگوان بنانے کے لئے اس کا نام یشودھا رکھا۔ لیکن جب وہ پنگھٹ پر پانی بھرنے کے لئے جانے لگی تو ایک دن بستی کے ایک شریر نوجوان نے غلیل چلا کر پانی سے بھری ہوئی اس کی گاگر توڑ دی۔ یشودھا نے غصے سے کہا۔

"تو نے گاگر توڑ دی، پانی گرا دیا، ساڑھی بھگو دی — مجھے تنگ کر کے تجھے کیا ملا؟"

نوجوان نے مسکرا کر کہا۔ "کرشن کنہیا بھی اپنی رادھا کو اس طرح ستایا کرتے تھے۔"

"مگر میں رادھا نہیں ہوں۔ میرا نام یشودھا ہے۔"

"کسی ماں کا نام یشودھا ہو تو اچھا لگتا ہے۔ تیرے جیسی جوان، چنچل اور البیلی ناری صرف رادھا کے روپ میں اچھی لگتی ہے۔"

یہ بات یشودھا کے من میں بیٹھ گئی۔ اسے احساس ہو گیا کہ وہ دنیا کی جوان آنکھوں میں سمانے کے لئے جوان ہو گئی ہے۔ اس رات وہ دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔ اس نوجوان کی نگاہوں کی گرمی کبھی اس کا یہ پہلو اور کبھی وہ پہلو جلاتی رہی۔ دوسرے دن پنگھٹ پر نوجوان نے کہا۔

"میرا نام مرلی دھر ہے۔ آج رات جب چاند ڈوب جائے گا تو میں تیرے مکان کے پچھواڑے کھلیان میں انتظار کروں گا۔"

اس کی یہ بات انگارے کی طرح چور جذبوں کو چھولیتی تھی۔ رات آئی تو وہ اپنے جذبات سے ڈرنے لگی کہ کھلیان میں نہیں جائے گی۔ یہ بری بات ہے۔ واقعی یہ باتیں بری ہوتی ہیں کوئی بھی سیدھی سادی شریف سی لڑکی خود کبھی بے شرمی کی طرف نہیں جاتی۔ جوانی کا مقناطیس جبراً اسے اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اس کنواری نے سوچا۔

رادھا بھی شیام سانورے سے ملنے جاتی تھی۔ اگر اس میں کوئی برائی ہوتی تو بھگوان خود کبھی ایسا نہ کرتے۔ ان کی مرلی کی تان سمجھاتی ہے کہ پریم جال سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ پریم ایسی شکتی ہے جو رادھا کرشن کے روپ میں پوجی جاتی ہے۔

جب چاند ڈوب گیا تو کھلیان میں یشودھا کا حسن طلوع ہو گیا۔ دنیا کے تمام ماں باپ اپنی جوان بیٹیوں کے آگے لکھن ریکھا کھینچتے ہیں کہ بیٹیاں اس حیا اور حفاظت کی لکیر سے باہر قدم نہ نکالیں لیکن پریم شکتی اسے کھینچ کر لے گئی تھی۔ اس سے یشودھا نے یہ نہیں سوچا کہ پریم اور پاپ کے بیچ ایک بال برابر فاصلہ ہوتا ہے۔ جانے انجانے میں ڈوب کر یہ فاصلہ کیسے ختم ہو جاتا ہے، یہ پتہ نہیں چلتا۔ پھر بھی وہ بڑی سہمی ہوئی تھی۔ مرلی دھر نے فاصلے کو پاٹنا چاہا تو وہ کترا گئی۔

"نہیں مرلی! اگر تم بیاہ سے پہلے مجھے ہاتھ بھی لگاؤ گے تو میں اپنی نظروں سے گر جاؤں گی۔ تم میرے من میں سما گئے ہو۔ اس لئے چلی آئی ہوں میرے اس طرح آنے کی لاج رکھو

کام لینا پڑتا ہے اس لئے وہ مُرلی دھر کی عقل کے مطابق کام کرنے لگی۔ ایک ماہ بعد فلم کے ایک ایسے سین کا ریہرسل تھا جس میں ولین ہیروئن کو دھوکے سے شراب پلا کر اس کی عزت لوٹ لیتا ہے پنّالال نے اسے سمجھایا کہ اب اسے ایک گلاس میں شربت پلایا جائے گا اور وہ پینے کے بعد ایسی ایکٹنگ کرے گی جیسے سچ مچ شراب پی لی ہو یشودھا نے کہا۔

"میں ایک شرابی عورت کی ایکٹنگ کیسے کروں گی۔ میں کیا جانوں کہ شراب پی کر کیسا لگتا ہے؟"

"تم فکر نہ کرو۔" پنّالال نے کہا کہ "یہ آہستہ آہستہ تم سب کچھ سیکھ جاؤ گی۔ شراب تو معمولی سی چیز ہے۔ تم زہر پی کر بھی مرنے کی کامیاب اداکاری دکھا سکو گی۔ چلو اب اس گلاس کے شربت کو ایک سانس میں پی جاؤ۔"

یشودھا نے گلاس کو اٹھایا۔ مگر چند گھونٹ پینے کے بعد اُسے اُبکائی سی آنے لگی۔ حلق جلنے لگا۔ پنّالال نے ذرا جلدی سے کہا۔

"شربت کو میں نے جان بوجھ کر ذرا کڑوا رکھا ہے تاکہ تم خود کو سچ مچ شراب پیتی ہوئی محسوس کرو۔ اس لئے کہتا ہوں کہ ایک سانس میں پی جاؤ۔"

شراب ہو یا زہر پہلی بار پیتے وقت ایک سانس کی مدت بھی بہت ہوتی ہے۔ دوسری سانس میں گلاس خالی ہو گیا مگر سر میں آندھیاں سما گئیں۔ ساری دنیا اس کے چاروں طرف گھومنے لگی۔ اس وقت جو کچھ اُس پر گزر رہی تھی، اسے وہ فلم کا سین سمجھ رہی تھی کیونکہ زندگی میں جو کچھ ہوتا ہے وہ فلموں میں دہرایا جاتا ہے اور فلموں کے ذریعہ جو کچھ سکھایا جاتا ہے زندگی میں اس کی پکی ریہرسل ہوتی ہے۔

جب اسے ہوش آیا تو وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ شام مُرلی دھر آیا تو وہ اس کے قدموں سے لپٹ کر روتے ہوئے صاف صاف کہنے لگی۔

"اب میں آپ کے قابل نہیں رہی۔ جس پنّالال کو تم دیوتا کہتے تھے، اس نے دیو بن کر مجھے مسل ڈالا ہے۔ میں آپ سے مارے شرم کے آنکھ نہیں ملا سکتی۔ میں مر جاؤں گی۔"

مُرلی دھر نے اسے قدموں سے اٹھا کر سینے سے لگایا۔

"میری جان! اتنی ذرا سی بات پر رو رہی ہو۔ پہلے ہی چانس میں پانچ فلموں کی ہیروئن بننے کے لئے ہر طرح کی قربانی دینی پڑتی ہے......"

یشودھا نے چونک کر سر اٹھایا۔ پھر حیرانی سے اس کا منہ تکنے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ مُرلی دھر یہ بات سنتے ہی غیرت کے جوش میں پنّالال کو قتل کرے گا۔ یا پھر اپنی دھرم پتنی کا ہاتھ تھام کر ساری دولت اور جھوٹی عزت و شہرت کو ٹھوکریں مار کر اُسے گاؤں واپس لے جائے گا لیکن اپنے پتی کی بے غیرتی دیکھ کر جیسے ایک جھٹکے سے اُسے عقل آ گئی کہ وہ اس کا پتی کب تھا؟ پتی کہاں ہوا تھا؟ اس بھگوان کے سامنے جو پتھر کا بنا ہوا تھا۔ اگر اس پتھر کے سینے میں دل ہوتا تو وہ اسے ٹھوکریں کھانے سے پہلے ہی بچا لیتا۔ مگر یہ بے غیرتی اوپر سے نیچے تک ہے۔ بھگوان نے بڑی خاموشی سے اسے مُرلی دھر کی بے غیرت جھولی میں ڈالا۔ مُرلی دھر نے اسی طرح پنّالال کی گود میں اُسے ڈال دیا۔ ایسے وقت میں سمجھ میں نہیں آتا کہ بھگوان اور انسان دونوں کا عمل ایک جیسا کیوں ہوتا ہے؟

اس روز وہ مُرلی دھر سے کچھ نہ بولی۔ من ہی من میں کڑھتی رہی۔ دوسرے دن پنّالال آیا تو وہ بولی۔

"سیٹھ صاحب! ایگریمنٹ کس سے ہوا ہے؟"

"تم سے......"

"آپ ہر ماہ بیس ہزار روپے کس کے ہاتھوں میں رکھیں گے؟"

"تمہارے ہاتھوں میں......"

"یہ کوٹھی اور کار کس کی ہے؟"

"وہ تمہاری ہے میری جان!"

"جب میں تمہاری جان ہوں تو یہ دلال اس کوٹھی میں کیوں رہتا ہے اسے دھکے مار کر نکال دو۔"

یشودھا نے نفرت سے مرلی دھر کی طرف اشارہ کیا تو وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"ارے یشودھا یہ کیا بکواس کر رہی ہو۔ کیا تم ہوش میں ہو کر تم نے اپنے پتی کا اپمان (توہین) کیا ہے؟"

"میں ابھی ہوش میں آئی ہوں۔ تم میرے پتی کب تھے؟ اور تم کیا جانو کہ پتی کیا ہوتا ہے؟ ارے بے شرم! مرد وہ ہوتا ہے جو ایک ہاتھ سے اپنی عورت کا ہاتھ پکڑتا ہے اور دوسرا اٹھا کر اس کے لئے ساری دنیا سے لڑتا ہے مگر تم دلال ہو دلال نکل جاؤ میرے گھر سے ___ جب میں محنت کرتی ہوں، میں کماتی ہوں، میں اپنی پرورش آپ کرتی ہوں۔ سب کچھ میں ہی کرتی ہوں تو پھر تمہارا یہاں کیا کام ہے؟ میں ایک کتے کو پال سکتی ہوں تمہیں نہیں پال سکتی۔ سیٹھ پنا لال اگر مجھ سے دوستی رکھنا چاہتے ہو تو اس بے غیرت کو ابھی یہاں سے نکال دو۔"

یشودھا کے اس حکم کے بعد مرلی دھر دو دھکوں میں باہر ہو گیا۔ پنا لال کے آدمیوں نے اسے چٹکی سے پکڑ کر کوٹھی سے باہر پھینک دیا۔ اس کے ایک ہفتہ بعد فلم کی پبلسٹی شروع ہوئی تو پنا لال نے کہا۔

"یہ یشودھا جیسا نام بہت پرانا ہے تمہارا کوئی ماڈرن قسم کا نام ہونا چاہئے۔"

یشودھا نے کہا۔

"ہاں یشودھا بہت ہی پوتر (مقدس) نام ہے میرے ماتا پتا اس نام کے سائے میں مجھے ایک شریف لڑکی بنانا چاہتے تھے۔ آہ۔ میرے بھاگ (نصیب) میں یہ دلال لکھے تھے چنانچہ اب کوئی بدمعاش قسم کا نام رکھ دو۔"

پنا لال نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اب تم زہریلی باتیں کرنا سیکھ گئی ہو۔ اب تمہاری اداکاری میں نکھار آ گیا۔ میرا خیال ہے تمہارا نام رانی ہونا چاہئے تم فلم دیکھنے والوں کے دلوں پر راج کرو گی۔"

"صرف رانی نہیں، میرے اپنے نام کا بھی کچھ حصہ ہونا چاہئے۔ تاکہ میں اپنے آپ کو یاد رکھ سکوں۔ یشو رانی کیسا نام ہو گا؟"

"بہت خوبصورت۔ بس آج سے تمہارا نام یہی ہے۔"

یشو رانی اپنے نام کے ساتھ سب کچھ بدل گئی۔ دو ماہ بعد فلم کی شوٹنگ شروع ہو گئی۔ آٹھ ماہ کے بعد وہ فلم مکمل ہو کر ریلیز ہوئی تو دیس کے کونے کونے میں یشو رانی کے نام کا ڈنکا بجنے لگا۔ تمام پروڈیوسر اور فلم ساز اس کے دروازے پر آنے لگے لیکن وہ پانچ سال تک پنا لال کی پابند تھی پنا لال اسے ہر ماہ ایک لاکھ روپے دے رہا تھا اور وعدہ کر رہا تھا کہ دوسری فلم مکمل ہوتے ہی اس سے شادی کرے گا۔ اگرچہ پنا لال سے بھی زیادہ دولت مند لوگ اس سے شادی کی تمنا کر رہے تھے لیکن یشو رانی نے سوچا جو اس کی عزت تک پہنچ چکا ہے اسی ایک مرد کی ہو کر رہے تو بہتر ہے اس لئے وہ دوسری فلم کے ریلیز ہونے تک پھر ایک ازدواجی اور گھریلو زندگی کے خواب دیکھنے لگی۔

دوسری فلم ریلیز ہوئی مگر باکس آفس پر کامیاب نہ ہوئی۔ ایسے ہی وقت یشو رانی کو پتہ چلا کہ وہ ماں بننے والی ہے اس نے فون پر پنا لال کو اطلاع دی کہ فوراً ہی شادی کرو۔ ورنہ ہمارا بچہ ناجائز کہلائے گا۔ پنا لال فلم کی ناکامی کے باعث سر پکڑے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے جھنجلا کر جواب دیا۔

"میرے ایک کروڑ روپے ڈوب گئے ہیں اور تمہیں شادی اور رنگ رلیوں کی سوجھ رہی ہے۔ ابھی میرے ساتھ بکواس نہ کرو۔"

یشو رانی نے غصے سے کہا۔

"تم بھلا اس نرکو جب میں ڈوب رہی ہوں تو تمہارے ڈوبنے کی پروا نہیں کروں گی
جانے ہونے والے بچے کو بدنامی سے بچاؤ۔ نہیں تو میں تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گی۔"

پنالال نرم پڑ گیا۔ کیونکہ یشو رانی اب پہلے جیسی کمزور اور بے سہارا عورت نہیں
تھی کتنے ہی دولت مند ہاتھ اسے سہارا دینے کے لئے تیار تھے۔ ایک مشہور فلمی ہیرو
چندر شیکھر اس سے دیوانہ وار عشق کرتا تھا۔ پنالال نے شیکھر سے ملاقات کی اور اس سے پوچھا۔

"میں یشو رانی کو چھوڑنا چاہتا ہوں۔ کیا تم اسے اپناؤ گے؟"

شیکھر نے ایک دم سے خوش ہو کر کہا۔

"میں دل و جان سے اُسے اپناؤں گا۔ مگر مجھے یقین نہیں آتا کہ تم اتنی حسین
عورت کو میری خاطر چھوڑ دو گے۔"

"یقین کرو۔ میری دو شرطیں مان کر تم اسے حاصل کر سکتے ہو۔ پہلی شرط یہ ہے
کہ تمہیں کل ہی یشو رانی سے بیاہ کرنا ہوگا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ تم میری اگلی فلم میں کام کرنے
کا معاوضہ نہیں لو گے۔"

"مجھے منظور ہے۔"

"تو پھر جاؤ، اور یشو رانی کو یہ خوشخبری خود ہی سنا دو کہ تم اس سے بیاہ کر
کے اس کے ہونے والے بچے کے باپ بن جاؤ گے۔"

"کیا مطلب؟" شیکھر نے چونک کر پوچھا۔

"کیا تم اسے اس جرم کی وجہ سے چھوڑ رہے ہو کہ وہ تمہارے بچے کی ماں بننے والی
ہے؟ یہ تو بڑا ہی کمینہ پن ہے۔"

"شیکھر! میں فضول باتیں نہیں کرنا چاہتا۔ اپنا آخری فیصلہ سنا دو۔ میری دو
شرطیں منظور کرتے ہو یا نہیں؟"

"میں یشو رانی سے سچی محبت کرتا ہوں ـــ اس سے ہر حال میں شادی کروں گا۔"

وہ بڑے عزم سے یشو رانی کے پاس چلا گیا۔ پنالال اطمینان سے اپنے گھر میں بیٹھ گیا۔
اس کا خیال تھا کہ ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا کافی ہوتا ہے یشو رانی کو بھی فوری طور پر اپنے
بچے کے لئے ایک باپ کی ضرورت ہے لہٰذا وہ شیکھر کو قبول کر لے گی لیکن رات کے دس بجے ملازم
نے آکر اطلاع دی کہ یشو رانی ملنے آئی ہے۔

پنالال نے کہا۔

"جا کر کہہ دو سیٹھ صاحب گھر میں نہیں ہیں کل آ کر ملاقات کرے۔"

ملازم چلا گیا۔ پنالال ڈر گیا تھا کہ وہ ہنگامہ کرنے آئی تھی اور آسانی سے اس کا پیچھا
نہیں چھوڑے گی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ کچھ دنوں کے لئے بمبئی چھوڑ دے گا۔ جب وہ ہر پچھتا
کر شیکھر سے شادی کرے گی تو پھر واپس آ جائے گا۔ ملازم نے واپس آ کر بتایا کہ یشو رانی
واپس چلی گئی ہے اسے اطمینان ہو گیا کہ بلا ٹل گئی ہے۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ اپنے بیڈ روم میں سونے کے لئے گیا تو وہ بلا وہاں موجود
تھی۔ پنالال نے گھبرا کر پوچھا۔

"تم یہاں کیسے آ گئیں"

"کیا اس بیڈ روم میں میں پہلے کبھی نہیں آئی۔ آج کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ آرام سے بیٹھو۔"

"میں بیٹھنے نہیں، جانے تمہارے پچھلے گناہوں کا حساب کرنے آئی ہوں۔ ہوس
کے غلام کیا تم اس دن کے لئے مجھے محبت کا فریب دیتے تھے تم لوگ اتنی بے شرمی کے بعد
بھی مرد کیسے کہلاتے ہو مرلی دھر نے مجھے تمہارے حوالے کیا اور اب تم مجھے شیکھر کے حوالے
کر رہے ہو کیا اپنی بیٹی اور بہن کے ساتھ بھی ایسا ہی کرتے ہو۔"

"دیکھو یشو رانی! جھگڑا نہ بڑھاؤ۔ میں خاندانی آدمی ہوں۔ تم ذلتوں میں پلنے
والی عورت ہو اگر میں تم سے شادی کروں گا تو برادری والوں سے سارے ناطے ٹوٹ جائیں گے

دوسری فلم میں میری رقم ڈوب گئی ہے۔ تیسری فلم کے لئے میرا باپ مجھے رقم نہیں دے گا۔ ہم دونوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ ہم صرف پروڈیوسر اور ہیروئن کے ناطے ایک دوسرے کا ساتھ دیتے رہیں۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیئے کہ شیکھر جیسا ہیرو تمہارا جیون ساتھی بننا چاہتا ہے۔"

"شیکھر آدمی نہیں دیوتا ہے۔ سچی محبت اسے کہتے ہیں۔ وہ میرا پاپ اور بچے کا باپ بن کر میرے گناہوں پر پردہ ڈال دے گا۔ میں ایسے مرد کو بھگوان بنا کر پوجتی رہوں تو بھی کم ہے۔ مگر ابھی تو میں تم سے نپٹنے آئی ہوں۔ میری عزت اتنی سستی نہیں ہے کہ تم اسے پرشاد (پرچار مٹھائی) کی طرح دوسروں میں بانٹتے رہو۔ میرا دھرم نشٹ ہو گیا ہے مگر تم زندہ نہیں بچو گے۔"

یہ کہتے ہی اس نے پیتل کا گلدان اٹھا کر اس پر حملہ کیا۔ پہلی بار تو وہ بچ گیا۔ دوسری بار اپنی دھوتی سنبھالتے سنبھالتے مار کھا گیا۔ یشودا کے اندر لاوا پک رہا تھا۔ غصہ اور جنون میں وہ اس کے سر پر گلدان سے ضربیں لگاتی رہی۔ پھر اس وقت ہوش آیا جب پنالال خون میں لت پت ہو کر فرش پر ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا ہو گیا۔

یشودا دیدے پھاڑ پھاڑ کر اُسے دیکھنے لگی۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس نے ایک انسان کی جان لی ہے۔ ایسے وقت اسے اپنے ہونے والے بچے کا خیال آیا اگر وہ جیل جائے گی تو اس معصوم بچے کا کیا بنے گا۔ جب اس نے حالات پر غور کر کے سوچا تو عقل آ گئی۔ اس نے پیتل کے گلدان کو ساڑھی کے آنچل سے صاف کیا۔ پھر کمرے سے باہر جاتے وقت بھی ان تمام جگہوں کو پونچھتی چلی گئی جہاں اس کی انگلیوں کے نشانات پائے جا سکتے تھے۔

اتنی احتیاط کے باوجود دوسری صبح پولیس اس کے دروازے پر پہنچ گئی۔ قانون کے ہاتھ اسے حوالات میں لے گئے پھر حوالات سے کچہری اور کچہری سے جیل میں لے گئے

مقدمہ چلنے کے دوران بڑے بڑے فلم ساز اسے سزا سے بچانے کی کوشش کرتے رہے۔ شیکھر اکثر اس سے ملنے آتا تھا اور اسے تسلیاں دیتا رہتا تھا۔ پنالال کے ملازم کی گواہی نے اسے جیل میں پہنچا دیا تھا۔ لیکن گواہ نے یہ بھی کہا تھا کہ جب پنالال نے ملاقات سے انکار کر دیا تو یشودا واپس چلی گئی تھی۔ پنالال کا ________ باپ یشودا سے عار کھائے بیٹھا تھا۔ اس لئے اسے سزائے موت دلانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔

مقدمہ کے دوران مہینے گزر گئے۔ زچگی کا وقت قریب آ گیا۔ ادھر دن بدن مقدمہ اس کے خلاف جا رہا تھا اور وہ سوچتی رہتی تھی کہ اگر اسے پھانسی کی سزا ملے گی تو بچے کا کیا انجام ہوگا۔ جیلر اور دوسری قیدی عورتیں سمجھاتی تھیں کہ بچے کو کسی آشرم میں چھوڑ دینا چاہیئے۔ اگر نہیں چھوڑے گی تو پھانسی کا پھندہ اُسے چھڑا دے گا۔

آخر وہی ہوا۔ پولیس ہسپتال کے میٹرنٹی ہوم میں بچے نے جنم لیا۔ دو دن وہ بچہ اس کے پاس رہا پھر وہ جیل میں منتقل کر دی گئی تھی اس طرح وہ بچہ جیالال لوٹس کے آشرم میں پہنچ گیا۔

اب وہ جیل کی آہنی سلاخوں کو تھام کر خلاء میں گھور رہی تھی۔ یہ انسان کی بہت پرانی عادت ہے کہ جب وہ اپنے اندر جھانکتا ہے تو بے اختیار ماضی میں کھو جاتا ہے مگر اب یشودا ماضی کے بے نام خلاء سے واپس آ گئی تھی اور سوچ رہی تھی۔

"کیا مجھے پھانسی کی سزا ہوگی؟ نہیں، نہیں میں زندہ رہوں گی۔ جیل کی اس چار دیواری سے باہر جاؤں گی اور آشرم میں پہنچ کر اپنے بچے کو سینے سے لگاؤں گی۔ اُسے ہر قیمت پر آشرم سے حاصل کروں گی۔"

*

پندرہ ستمبر کی صبح جیل میں یہ حادثہ پیش آیا تھا۔ دن کے گیارہ بجے تک ریڈیو کے ذریعہ یہ خبر ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ گئی تھی۔ کوئی ایسا گھر نہیں تھا جہاں ایک مظلوم اور دہشت زدہ بچے کا ذکر نہ ہو رہا ہو۔ کوئی ایسا دل نہیں

itsurdu.blogspot.com

تھا جو بچے کی سلامتی کے لئے دعائیں نہ مانگ رہا ہو۔ ملک کے کونے کونے سے مختلف ریڈیو اسٹیشنوں کو فون کر کے یہ مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ اس بچے کے متعلق ایک ایک لمحے کی خبر نشر کی جائے۔ لہٰذا ہر آدھے گھنٹے کے بعد ریڈیو کے ذریعہ یہ یقین دلایا جا رہا تھا کہ بچے کے سلسلے میں جیسے جیسے خبریں موصول ہوتی رہیں گی انہیں عوام تک پہنچایا جاتا رہے گا۔

کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ بچہ مر چکا ہوگا۔ کچھ لوگ یہ سوچ کر کانپ جاتے تھے کہ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک ننھا سا بچہ دوپہر کی دھوپ اور رات کی سردی کا مقابلہ کیسے کرے گا؟ وہ حادثہ سے بچنے کے بعد رات کی تاریکی میں دہشت سے مر جائیگا۔ دوپہر کو ریڈیو سے یہ خبر سنائی گئی کہ ہیلی کاپٹر سے جائی کے لئے کھانے کا سامان اور کمبل وغیرہ پھینکے جا رہے ہیں۔

آدھ گھنٹے کے بعد پھر یہ خبر سنائی گئی کہ پولیس، اسکاوٹ اور فوجی نوجوان اس پہاڑی کے دامن میں کیمپ لگا رہے ہیں ریڈیو محکمہ اطلاعات اور اخبارات کے رپورٹر اور فوٹو گرافر بھی وہاں پہنچ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ فوری طور پر بجلی پہنچائی جا رہی ہے تاکہ رات کے وقت دور تک اس پہاڑی کو روشن رکھا جا سکے اس کے باوجود وہ بجلی کی روشنی جائی کی بلندی تک نہیں پہنچا سکتے تھے۔

جیسے ساری خلقت نے حادثہ کی یہ خبر سن لی تھی۔ صرف ایک بانو اس خبر سے بے خبر تھی وہ صبح سے کچھ نامعلوم سی بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ ریڈیو آن کر کے کوئی گیتوں بھرا پروگرام سننے کو دل نہیں چاہا۔ اس لئے گھر کا ریڈیو خاموش پڑا رہا۔ شام کو پانچ بجے سرتاج حسین فوجی جیپ میں بیٹھ کر آیا تو اس کے ہاتھوں میں شام کا اخبار تھا اس نے اخبار کو بانو کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"آج ریڈیو سنا تھا؟"

"نہیں، میرے سر میں درد ہو رہا ہے"

"آج کی خبریں سن کر تمام انسانوں کے دل میں درد اٹھ رہا ہے ایک طیارہ پہاڑی چٹان سے ٹکرا گیا ہے"

"ہوائی جہاز کے حادثات ہوتے ہی رہتے ہیں یہ افسوس کی بات ہے مگر کوئی نئی بات تو نہیں ہے"

"نئی بات یہ ہے بانو کہ ایک پانچ برس کا بچہ زندہ بچ گیا ہے بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر تنہا پڑا ہوا ہے"

بانو کا دل دھک سے رہ گیا۔ پانچ برس کی گنتی کے ساتھ ہی اپنے بچے کی جدائی تڑپانے لگی۔ اس نے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے اخبار کو دیکھا پہلے صفحہ پر جائی کی تصویر تھی بڑی ہی من موہنی دل میں اتر جانے والی تصویر تھی۔ بانو نے سوچا "میرا بچہ بھی اتنا ہی بڑا ہوگا اور ایسا ہی معصوم اور خوبصورت ہوگا......"

سرتاج حسین نے کہا "ذرا گرما گرم چائے پلاؤ۔ میں ابھی چلا جاؤں گا۔ پہاڑی کے دامن میں میری ڈیوٹی ہے میرا خیال ہے بچے کو اتنی بلندی سے نیچے لانے تک ساری رات گذر جائے گی۔ ساری رات جاگنا ہوگا"

یہ کہتے ہوئے اس نے ریڈیو کا سوئچ آن کر دیا۔ موسیقی کا پروگرام نشر ہو رہا تھا وہ چائے بنانے کے لئے کچن میں چلی گئی۔ اگر وہ اپنے ساتھ اخبار لے جاتی تو چائے تیار ہونے کے دوران وہ دوسری خبر معلومات حاصل کر سکتی تھی۔ لیکن اخبار کی صرف ایک تصویر نے اسے دور ماضی میں پہنچا دیا تھا۔

جب وہ ایک ٹرے پر چائے سے بھری ہوئی دو پیالیاں رکھ کر اپنے سرتاج کے پاس جانے لگی تو موسیقی کی آواز دور سے سنائی دے رہی تھی۔ پھر اچانک ہی وہ آواز تھم گئی اور کسی مرد کی آواز سنائی دینے لگی۔

"یہ آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس ہے چند منٹ کے لئے موسیقی کا پروگرام روک کر جانی کے متعلق تازہ ترین معلومات فراہم کی جا رہی ہیں۔ سامعین! وہ بدنصیب جانی جو اپنے مردہ ماں باپ کے قریب زندہ ہے وہ دراصل ایک لے پالک بچہ ہے جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں اس کی تاریخ پیدائش......"

بانو ایک دم سے ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی۔ پندرہ ستمبر کی تاریخ سن کر اس کے ہاتھوں میں چائے کی ٹرے کانپ رہی تھی۔ ریڈیو کی آواز نے کہا۔

"اب ایک مقامی اخبار نے یہ انکشاف کیا ہے کہ مسٹر رگ پاشی مہیشن چندر چڑجی اور ان کی دھرم پتنی نے اس بچے کو جلپائی گوڑی کے بالک آشرم سے حاصل کیا تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی اصلی ماں......"

ایک زور کا دھماکہ ہوا، حالانکہ چائے کی پیالیاں گر کر ٹوٹنے سے دھماکہ نہیں ہوتا۔ سرتاج ایک دم سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا ہوا بانو؟"

کیا ہوا؟ بانو کیسے بتاتی کہ کیا نہیں ہوا۔ ایک ننھا سا بچہ اس کے سینے پر لاتیں مار رہا تھا۔ "امی۔ امی! نانی جان نے مجھے جلپائی گوڑی کے بالک آشرم میں چھوڑا تھا" وہ بچہ بانو کے دل کو اپنی ننھی مٹھیوں میں مسل رہا تھا۔ "امی۔ امی! آپ نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔ دیکھئے تقدیر نے بھی مجھے کہاں لے جا کر چھوڑ دیا ہے مجھے ایسی بلندی نہیں چاہئے۔ مجھے اپنی گود میں اتار لیں امی......"

بانو نے ممتا سے بے قابو ہو کر دونوں ہاتھ اپنے سینے کے اطراف یوں بھینچ لئے جیسے بچے کو نامعلوم بلندی سے اتار کر سینے سے لگا رہی ہو۔ ایسے وقت وہ بھول گئی تھی کہ اس کا سرتاج اس کے سامنے موجود ہے۔ یوں تو اس کے پاس کی اور بھی بہت ساری دنیا آباد تھی مگر اسے اپنے بچے کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا جس بچے کو اس نے جنم دیا تھا اور

جس کی صورت اس نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اب اس بچے کے تصور کو جانی کی تصویر سے قائم کر رہی تھی۔

پھر وہ چونک گئی۔ سرتاج اس کے دونوں بازو پکڑ کر جھنجھوڑ رہا تھا۔ "بانو کچھ تو کہو۔ یہ اچانک تمہیں کیا ہو گیا ہے"

وہ دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ کر رونے لگی۔ اب اسے اپنی بے بسی کا احساس ہوا کہ وہ صرف ایک بچے والی نہیں، ایک شوہر والی بھی ہے اور اپنے شوہر سے اس گمنام بچے کا وجود چھپاتی آئی ہے اب وہ کس طرح چھپا سکتی ہے؟ اگر اب بھی اپنی زبان بند رکھے گی تو بچے کے پاس کبھی نہیں پہنچ سکے گی اور اگر زبان کھولے گی تو سرتاج کے دل کو ٹھیس پہنچے گی۔ وہ اب تک اسے دل و جان سے چاہتا رہا۔ اپنی محبوب بیوی کا جھوٹ اور فریب سامنے آئے گا تو جنون کی حد تک محبت کرنے والے شوہر کا رد عمل کیا ہوگا ہو سکتا ہے کہ وہ اس فریب کو برداشت نہ کرے اور اسے طلاق دے دے۔

وہ دوراہے پر کھڑی تھی۔ ایک طرف سرتاج کی رفاقت تھی عزت آبرو اور خوشگوار ازدواجی زندگی تھی۔ دوسری طرف پانچ برس سے بچھڑے ہوئے لاپتہ بچے کا پیار اپنا پتہ بتا رہا تھا۔ اب وہ اپنے دامن میں طلاق نامہ اور بدنامیاں لے کر اپنی ممتا کی تسکین کر سکتی تھی۔ اس نے ذرا سی دیر میں فیصلہ کر لیا کہ سرتاج کو سیکڑوں بیویاں مل سکتی ہیں مگر ایک ماں نے دیر کر دی تو وہ بچہ پھر نہ مل سکے گا۔

سرتاج سمجھ رہا تھا کہ بانو کو کسی قسم کا ذہنی صدمہ پہنچا ہے اس نے تسلی دینے کے لئے اسے سینے سے لگایا۔ وہ ایک دم سے تڑپ کر الگ ہو گئی۔ پھر رو رو کر کہنے لگی۔

"آپ مجھے سینے سے نہ لگائیں۔ میں آپ کے قابل نہیں ہوں۔ میں نے آپ کو دھوکا دیا ہے"

"کیسا دھوکا؟"

itsurdu.blogspot.com

"میں آپ کی بیوی بننے سے پہلے ۔۔۔ ایک مطلقہ عورت تھی۔ یہ حقیقت میں آپ سے چھپاتی رہی۔ اب آپ جو چاہیں مجھے سزا دیں۔"

بانو نے دیکھا وہ مسکرا رہا تھا۔ شاید طنزیہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ پھر وہ ہنسنے لگا۔ شاید اپنی شریک حیات کی بے حیائی پر ہنس رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

"میں سپاہی ہوں، اور سپاہی کسی علاقہ کو فتح کرنے سے پہلے اس کے جغرافیائی حالات سے واقف ہو جاتا ہے۔ میں نے بھی تمہیں اپنی منکوحہ بنانے سے پہلے معلومات حاصل کی تھیں۔ پتہ چلا کہ تم ماں جیٹھ پہلے جلپائی گوڑی میں رہتی تھیں۔ وہاں جا کر مسلمانوں کے محلے میں پتہ چلا کہ آصف نام کے کسی شرابی جواری سے تمہاری شادی ہوئی تھی وہ تمہارا گھر لوٹ کر اور تمہیں طلاق دے کر چلا گیا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ تم ایک بچے کی ماں بننے والی تھیں۔ اب بتاؤ وہ بچہ پیدائش سے پہلے ضائع کر دیا گیا یا ......"

"نہیں، نہیں، وہ زندہ ہے" وہ قدموں سے لپٹ کر روتی چیختی ہوئی بولی "آپ مجھے مار ڈالیں مگر میرے بچے کو پہاڑ کی اس خطرناک بلندی سے زندہ سلامت اتار کر لے آئیں۔"

سرتاج نے حیران ہو کر قدموں سے لپٹی ہوئی بانو کو دیکھا۔ چشم زدن میں یہ واضح ہو گیا کہ جو بچہ پہاڑ کی بلندی پر ہے، اس کی ماں قدموں کی پستی پر بلک بلک کر رو رہی ہے اور ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان بتا رہی ہے کہ چودہ اور پندرہ ستمبر کی درمیانی شب کس طرح فرقہ وارانہ فساد کی آگ بھڑک گئی تھی۔ غنڈے نوزائیدہ بچوں کو نیزوں پر اچھال رہے تھے ان حالات میں بچے کو زندہ رکھنے کی خاطر آشرم میں چھوڑ دیا گیا تھا۔

سرتاج نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر قدموں سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"میں پورے تین سال سے انتظار کر رہا تھا کہ تم اپنی حقیقت بتاؤ گی۔ کبھی میں سوچتا تھا کہ تم جھوٹی اور خود غرض ہو۔ صرف اپنا مستقبل سنوارنے کے لئے تم نے مجھ سے شادی

ہے کبھی تنہائی کے لمحات میں تمہاری قربت اور محبت سے پتہ چلتا تھا کہ تم صرف مجھے چاہتی ہو۔ مگر اس چاہت کے دوران کوئی کانٹا سا کھٹکتا رہتا ہے اگر کوئی رقیب کانٹا بن کر سامنے آتا میں کبھی برداشت نہ کرتا۔ لیکن اب یہ سن کر اطمینان ہوا کہ ہماری محبت کے درمیان صرف ایک بچہ کھٹک رہا ہے اور ایک معصوم بچہ کسی کا دشمن نہیں ہوتا۔"

بانو نے خوشی سے روتے ہوئے کہا۔

"تو پھر آپ میری مدد کریں گے میرے لعل کو زندہ سلامت میری گود میں پہنچائیں گے۔"

"بانو! اس بچے کو صحیح سلامت پہاڑ کی چوٹی سے نیچے لانے کی ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔ اب میں بھی ایک باپ بن کر اس بچے میں دلچسپی لوں گا۔ میں وہاں جا رہا ہوں۔ تم فوراً جلپائی گوڑی کے آشرم میں پہنچ کر یہ ثبوت حاصل کرو کہ وہ بچہ تمہارا ہے یعنی تمہارا لعل۔"

"او سرتاج! آپ انسان نہیں فرشتہ ہیں آپ نے یہ کہہ کر مجھے ہمیشہ کے لئے خرید لیا ہے کہ آپ میرے اس بچے کے باپ ہیں۔"

وہ اس کے سینے سے لگ کر خوشی سے رونے لگی۔

*

میریا جب پہاڑی کے دامن میں پہنچی تو وہاں ہزاروں آدمیوں کا مجمع تھا۔ ہزاروں آنکھیں پہاڑ کی بلندی کی طرف اس عمودی چٹان پر لگی ہوئی تھیں جہاں سے وہ بچہ نظر نہیں آ سکتا تھا مگر ہزاروں دلوں میں ایک ہی حسرت تھی کہ وہ بخیریت نظر آ جائے۔ اتنے بڑے ہجوم کو روکنے کے لئے ڈوری کے موٹے موٹے رسّے باندھ کر حد بندی کر دی گئی تھی۔ حد بندی کے اندر فوجی نوجوان کوہ پیماؤں کی مدد کر رہے تھے۔ پہاڑ پر چڑھنے کی تیاریاں مکمل ہو گئی تھیں۔ رسّے کے چاروں طرف پولیس اور اسکاؤٹ کے

نوجوان کھڑے ہوئے تھے۔ حد بندی کے باہر ہوٹل کھل گئے تھے لوگوں کو رات گزارنے
کے لئے فی چارپائی پانچ روپے کے حساب سے مہیا کی جا رہی تھی۔ بستر، کمبل، گرم کپڑے
دھوپ کے چشمے، دوربین اور کھانے کی مختلف چیزیں فروخت ہو رہی تھیں۔ ایک بچہ جو کہ
زندگی اور موت کے درمیان ابھرتی بلندی پر پڑا ہوا تھا۔ اس کی پستی میں خود غرض لوگ
تجارت کر رہے تھے اور ایک گلاس پانی کی قیمت دس پیسے وصول کر رہے تھے۔

میریا اس ہجوم میں ادھر سے ادھر بھٹکتی ہوئی معلومات حاصل کر رہی تھی
کہ بچے کو بحفاظت نیچے اتارنے کے لئے کیسے کیسے انتظامات کئے گئے ہیں۔ وہاں
جتنے منہ اتنی باتیں تھیں۔ ہیلی کوپٹر اس عمودی چٹان کے قریب نہیں جا سکتا تھا۔ پیراشوٹ
کے ذریعے اترنے میں خطرہ تھا کہ اترنے والا نہ جانے کس کھڈ میں جا گرے۔ اس لئے دیس
کے مشہور اور تجربہ کار کوہ پیما اجیت سنگھ کی خدمات حاصل کی جا رہی تھیں۔ وہ اپنی
ٹیم کے ساتھ اس خطرناک بلندی کو سر کرنے کی سعی میں مصروف تھا۔ ایک اندازے کے مطابق
وہ صبح تک اس بچے کو واپس لا سکتا تھا۔

میریا کے دل کی عجیب حالت تھی وہ جب بھی آنکھوں سے دوربین لگا کر
بلندی کی طرف دیکھتی تو اس کا دل خوف اور مایوسی کی پستی میں ڈوبنے لگتا اور وہ ندامت
سے سوچنے لگتی۔ میں ظالم ہوں میں نے اس معصوم کو اپنے وجود سے نوچ کر پھینک دیا
اور اب میں اس کے لئے اندر ہی اندر مری جا رہی ہوں۔

پھر وہ سوچنے لگی یہ وہ میرا ہی بچہ ہوگا۔ بلکہ میرے ہی جگر کا ٹکڑا ہے خدا کرے
کہ دوسری دعویدار عورتیں یہاں نہ آئیں۔ میں ہزار بدنامیوں کے ساتھ اپنے لعل کو اپنے سینے
سے لگا کر یہاں سے لے جاؤں گی۔

اسے اپنے پیچھے داس دیو کی آواز سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ بھی
آنکھوں سے دوربین لگائے کوہ پیماؤں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بڑی بڑی سرخ

وشٹ دور پہاڑ کو روشن کر رہی تھیں۔ داس دیو نے آنکھوں سے دوربین ہٹاتے ہوئے کہا۔
"میریا! تم نے آج شام کا جلا اخبار پڑھا ہوگا اس میں [illegible]
سے کام کرتے ہیں۔"

میریا نے کوئی جواب نہیں دیا پھر وہ کہنے لگا۔
"میں اس یقین کے ساتھ آیا ہوں کہ جلا اخبار پڑھتے ہی ____ بچے کی ماں ضرور آئے
گی مگر افسوس ہجوم میں صرف ایک عورت تم ہی نظر آ رہی ہو۔"

میریا نے دھڑکتے ہوئے دل سے سوچا کیا میں جا کر کہوں کہ بچے کی ماں تمہارے سامنے کھڑی
ہے جو مگر نہیں۔ جب تک یہ راز ہے بہتر ہے......

اس کے دماغ کے کسی گوشے میں یہ بات تھی کہ پہلے بچے کا انجام دیکھ لینا چاہئے
اگر وہ زندہ سلامت واپس آ گیا تو وہ کھل کر بچے کا دعویٰ کرے گی ورنہ بچے کے ساتھ ماں
کے رشتے کو بھی دفن کر دے گی۔

اس کے سوچنے کے دوران داس دیو نے اچانک کہا۔
"وہ آ گئی جس کا انتظار تھا، وہ آ گئی میں وثوق سے کہتا ہوں کہ وہی اس بچے کی ماں ہے۔"

میریا نے گھوم کر دیکھا۔ بانو بھیڑ کو چیرتی ہوئی راستے کی طرف آ رہی تھی۔ اس کا
شلوار کرتا گرد آلود تھا۔ دوپٹہ ایک شانے سے ڈھلک کر اس کے قدموں سے الجھ رہا تھا چہرے
سے وحشت برس رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں یوں جنونی انداز میں پھیلی ہوئی تھیں
جیسے دل کی تمام دھڑکنیں آنکھوں کی دہلیز پر آ کر پکار رہی ہوں یہ میرا لعل رات بھر کہاں ہے
واپس آ جاؤ۔ میں دروازہ بند کروں گی......

داس دیو نے کہا یہ اس کی اجڑی ہوئی حالت بتا رہی ہے کہ وہ بچے کی ماں ہے
میں ابھی دھماکہ خیز معلومات حاصل کرتا ہوں کل کا اخبار بھی ہاتھوں ہاتھ بکے گا۔

بانو رستے سے پاس آئی پھر ذرا جھک کر حد بندی لائن کے اندر جانے لگی۔

ایک پولیس آفیسر نے اس کا راستہ روک کر کہا۔

"شریمتی جی! اندر آنا منع ہے آپ باہر چلی جائیں۔"

بانو نے ہانپتے ہوئے کہا "مجھے معلوم ہے تم سامنے سے ہٹ جاؤ گے۔ میں کیپٹن سراج حسین کی بیوی ہوں۔"

آفیسر فوراً ہی ادب سے ایک طرف ہٹ گیا۔ داس دیو بھی ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ میرا نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

"داس جی رک گئے؟ کیا فوجی کیپٹن کی بیوی نے تمہاری کھوپڑی میں دھماکا کر دیا ہے؟"

داس دیو آنکھیں سکیڑ کر دور جاتی ہوئی بانو کو دیکھ کر بولا۔

"تعجب ہے یہ تو مجھے کیپٹن کی بیوی نہیں، صرف ایک اجڑی ہوئی ماں نظر آتی ہے۔"

میرا بھی سنجیدگی سے بانو کے متعلق سوچنے لگی کہ ایک کیپٹن کی بیوی یہاں پریشان حال کیوں آئی ہے بچے سے اس کا کوئی تعلق ہو سکتا ہے مگر یہ تو مسلمان ہے اور بچہ ہندوؤں کے آشرم سے آیا ہے کیا ایک مسلمان ماں اپنے بچے کو ایسے آشرم میں چھوڑ سکتی ہے۔

چھوڑنے کی بات آئی تو یاد آیا کہ کوئی عورت اپنے بچے کو آشرم کے دروازے پر چھوڑ گئی تھی۔ کیا وہ عورت یہی کیپٹن کی بیوی تھی؟ میرا سوچتے سوچتے تھک گئی اس لئے بھی تھک گئی کہ وہ بچے کو صرف اپنی ملکیت سمجھتی تھی۔ کسی دوسری عورت کو اس کا حقدار سمجھنے سے تکلیف پہنچتی تھی۔ وہ تھکن مٹانے کے لئے ایک ریسٹورنٹ کی طرف چلنے لگی۔ داس دیو بھی اس کے ساتھ تھا اور اس سے کہہ رہا تھا۔

"تم عورت ہو کیپٹن کی بیوی سے دوستی کر کے بہت کچھ معلوم کر سکتی ہو۔"

میرا نے خشک لہجے میں کہا۔

"اگر میں کچھ معلومات حاصل کروں گی تو تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔"

"تم تو بیکار مجھے اپنا دشمن سمجھ رہی ہو اگر میں سچی خبریں شائع کرتا ہوں تو اس کے لئے

تمہیں ناراض نہیں ہونا چاہیئے۔"

"اگر سچی خبر سے کسی معصوم اور مظلوم کی زندگی تباہ ہوتی ہو تو اُسے شائع کرنا اخلاقی جرم ہے۔"

"کیا اس ناجائز بچے کو جنم دیتے وقت اس عورت کو اخلاقیات کا خیال نہیں آیا؟"

"تم کیا سمجھو گے کہ عورت کن حالات میں مجبور ہو جاتی ہے کس طرح محبت کے نام پر پگھل جاتی ہے؟ اور کس طرح دوسروں کی ہمدردی میں لُٹ جاتی ہے؟"

وہ میرا کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"کیا تمہارا اپنا ایسا کوئی تجربہ ہے؟"

وہ چائے کا آخری گھونٹ پی کر جلدی سے اٹھ گئی۔ داس دیو نے اس کی دُکھتی رگ پر انگلی رکھی تھی مگر وہ بھی باز آنے والی نہیں تھی۔ ہوٹل کے کاؤنٹر پر دو پیالی چائے کے پیسے ادا کرتی ہوئی بولی

"یہ میری اور میرے اس بیٹے کی چائے کے پیسے ہیں۔"

پھر وہ داس دیو کی طرف پلٹ کر بولی۔

"میں کسی اخبار میں شائع نہیں کروں گی کہ تم میرے ناجائز بیٹے ہو۔"

وہ تیزی سے چلتی ہوئی ہوٹل کے باہر چلی گئی داس دیو چند لمحوں تک ساکت رہ گیا۔ پھر اس نے غصے سے میرا کی جانب دیکھا لیکن غصہ دکھانے کا ٹھیک اسی وقت ایک بڑی سی ویگن کار ہوٹل کے قریب آ کر رکی۔ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر ایک بہت مشہور ہیرو شیکھر باہر آیا۔ پھر اس نے دوسری طرف کا دروازہ کھولا۔ اس دروازے سے اس مجمع کی تیسری عورت باہر آ رہی تھی۔

وہ سیاہ بارڈر کی سفید ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ سیاہ بلاؤز سے اُجلے بدن کی چاندنی پھوٹ رہی تھی۔ ماتھے پر چندن کا ٹیکا تھا۔ ریشمی جوڑے کے پس منظر میں اس کا

حسین چہرہ، مجھا بجھا سا تھا۔ گاڑی سے باہر آتے ہی اس کی آنکھیں پیاز کی تاریک چولی لے جاتی تھیں۔ وہ آنکھیں اپنی زبانی بے زبانی سے کہہ رہی تھیں۔

«میرے کرشن، میرے نند لال، میرے ماکھن چور، تجھ کو یشودھا کیا آگ سے ایک عیاش نے یہ نہیں سوچا کہ یہیں ماں بیٹے کے رشتے میں پڑ کر وہ سماج کو اور دھرم کو کتنی بڑی گالی دے رہا ہے۔ یہ تو صرف ماں کا حوصلہ ہوتا ہے کہ وہ اتنی بڑی گالی کو بڑے پیار سے دودھ پلاتی ہے نیچے اترا میرے لال، میری گود خالی ہے ......»

داس دیو نے اسے دیکھتے ہی میرا کے قریب آ کر کہا۔

«ارے یہ تو مشہور فلم اسٹار یشورانی ہے۔ میں نے سنا تھا کہ یہ کسی قتل کے کیس میں سزا کاٹ رہی تھی۔ اتنی مصروف اداکارہ ایک بچے کو دیکھنے یہاں آئی ہے۔ یقین نہیں آتا کہ یہ بچے کی ماں ہو سکتی ہے۔ میں ابھی معلوم کرتا ہوں۔»

وہ تیزی سے چلتا ہوا یشورانی کے پاس پہنچ گیا، پھر اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

«میڈم! میں ایوننگ نیوز کا رپورٹر ...... داس دیو ہوں۔ آپ نے آج شام کے اخبار میں پڑھا ہوگا کہ وہ بچہ لے پالک ہے، یعنی اس کی اصل ماں اب بھی کہیں زندہ ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ یہاں آئے گی۔ میں اس کی تلاش میں آیا ہوں۔»

یشورانی چند لمحوں تک اسے دیکھتی اور سوچتی رہی۔ پھر اس نے پوچھا۔

«آپ اس کی ماں کو تلاش کر کے کیا کریں گے؟»

«یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے میڈم! میں اس عورت کی تصویر اور اس کا بیان شائع کروں گا۔»

«کسی عورت اور ایک معصوم بچے پر کیچڑ اچھال کر تم کتنے پیسے کما لو گے؟»

«اوہ! میں تو سچائی ......»

وہ بات کاٹ کر بولی۔ «سچائی کی بات نہ کرو۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ

سچائی کی آبرو ریزی کس طرح ہوتی ہے۔» پھر اس نے شیکھر سے کہا۔

«شیکھر! اس رپورٹر سے پوچھو کہ اس کے اخباری دفتر اور پریس کی قیمت کیا ہے؟ یہ جتنے دام بتائے اتنے نوٹ اس کے منہ میں ٹھونس کر منہ بند کر دو۔»

وہ پیار سے سنبھالتی ہوئی رستے کی طرف جانے لگی۔ میرا تیز قدموں سے چلتی ہوئی اس کے ساتھ ہو گئی پھر اس سے بولی۔

«یشورانی! میرا نام میرا ہے۔ پہلے بھی ہمارا سامنا ہو چکا ہے۔ شاید تم نے مجھے پہچانا نہیں؟»

وہ رک کر اسے پہچاننے کی کوشش کرنے لگی پھر انکار میں سر ہلا کر بولی۔

«میرے لاکھوں پرستار ہیں۔ میں ہر ایک کا چہرہ یاد نہیں رکھ سکتی۔»

«میں تمہاری پرستار بن کر تمہارے سامنے نہیں آئی تھی۔ آج سے پانچ برس پہلے پندرہ ستمبر کی صبح ہم دونوں آشرم میں موجود تھیں اور ہم دونوں ایک ہی راستے سے وہاں گئی تھیں۔»

یشورانی نے ایک گہری سانس لی اور کہا۔

«اوہ! میں سمجھ گئی۔ میں پنڈت گردھاری لال سے مل چکی ہوں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ اس بچے کے تین دعویدار ہیں۔ ایک میں ہوں۔ دوسری تم نظر آ رہی ہو۔ کیا یہاں تیسرا بھی موجود ہے۔»

«ہاں، یہاں ایک عورت اور ہے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ وہ تیسری دعویدار ہو گی۔ بہتر ہے کہ ہم کہیں اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں۔»

«نہیں، پہلے میں اپنے بچے کی خبر لوں گی۔»

میرا نے تصحیح کی۔ «وہ اپنا بچہ نہیں، ہمارا بچہ۔ جب تک یہ فیصلہ نہ ہو جائے کہ وہ کس کا ہے اس وقت تک وہ ہم تینوں کا ہوگا۔»

یشورانی کو اس کی بات بری لگی۔ کیونکہ ممتا خود غرض ہوتی ہے اپنی گود کے بچے کو

دوسری کوکھ سے منسوب نہیں کر سکتی۔ لیکن ممتا دوسری ماؤں کا درد بھی سمجھتی ہے یشودانی کو تسلیم کرنا پڑا کہ فی الحال وہ تینوں کا مشترکہ بچہ ہے۔

میریا نے کہا۔ "صبح سے پہلے بچے کے متعلق کچھ نہیں معلوم ہو سکے گا۔ کیونکہ پیا اجیت سنگھ اپنی ٹیم کے ساتھ روانہ ہو چکا ہے جب تک کوئی نئی اطلاع ملے ہم کہیں تنہائی میں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

یشودانی اس کے ساتھ اپنی گاڑی میں آکر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے پوچھا۔

"اس بات کا فیصلہ کیسے ہوگا کہ وہ بچہ کس کا ہے؟"

"یہ میری سمجھ میں نہیں آتا — جب میں نے اپنے بچے کو جنم دیا تو اس وقت میں نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی میرے ایک ہمدرد ہری جی نے مجھے اس بچے کی صورت نہیں دکھائی کہ کہیں میری ممتا مچل نہ جائے۔ انہوں نے اسے آشرم میں پہنچا دیا۔ اگر میں اس کی صورت دیکھ بھی لیتی تو کیا پانچ برس کے بعد وہ صورت سے پہچانا جا سکتا ہے؟"

"نہیں" یشودانی نے کہا۔ "میں نے اسے جنم دینے کے بعد دیکھا تھا۔ آج اخبار میں اس کی تصویر بھی دیکھی۔ اب وہ پہچانا نہیں جاتا۔ پانچ برس میں بڑی تبدیلیاں آجاتی ہیں"

"کیا اس کے جسم پر کوئی واضح شناختی نشان تھا؟"

وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔

"اس بات کا مجھے خیال نہ رہا۔ مجھے اس کی کوئی نشانی یاد رکھنی چاہیے تھی مگر میں قتل کے مقدمے اور بچے کے بچھڑنے کے خیال سے اس طرح دماغی پریشانی میں مبتلا رہی کہ بچے کے کسی شناختی نشان کی طرف دھیان نہ دے سکی"

وہ بولتے بولتے سوچنے لگی "یہ کاش کر میں بچے کو آشرم میں نہ دیتی مگر وہ لوگ مجھے یقین دلا چکے تھے کہ مجھے پھانسی ہو جائے گی۔ ان دنوں شیکھر بھی دیس سے باہر ٹورنگ میں مصروف تھا ورنہ میں بچے کو اس کے حوالے کر دیتی۔ اور جب وہ واپس

آیا تو میری تقدیر نے بھی میرا ساتھ دیا۔ عدالت نے یہ کہہ کر مجھے بری کر دیا کہ پنا لال کے ملازم نے مجھے پنا لال سے ملاقات کئے بغیر واپس جاتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد دوبارہ اس نے مجھے اس کوٹھی میں نہیں دیکھا اور نہ ہی جائے واردات پر میری موجودگی کا کوئی ثبوت پایا گیا ہے محض شبہ کی بناء پر مجھے سزا نہیں دی جا سکتی۔

جیل سے رہا ہوتے ہی میں شیکھر کے ساتھ آشرم میں پہنچی تو ایک سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ پنڈت گردھاری لال نے یہ کہہ کر مایوس کر دیا کہ اس آشرم میں کسی کے بچے کی شناخت نہیں ہو سکتی۔ اس سلسلے میں وہ تحریری کارروائی نہیں کرتے ہیں۔ البتہ میرے یاد دلانے پر پنڈت جی کو یاد آگیا کہ چودہ اور پندرہ ستمبر کی درمیانی شب فرقہ وارانہ فسادات ہوئے تھے......"

میریا نے پوچھا۔ "یشودانی کیا سوچ رہی ہو؟"

"آں؟" وہ چونک کر بولی۔ "اپنے بچے کے لئے سوچ رہی ہوں۔ جوان ہو گیا ہے۔"

اسی وقت ان دونوں نے گاڑی کے باہر دیکھا۔ باہر تاریکی میں ایک عورت سائے کی طرح نظر آرہی تھی۔ میریا نے فوراً ہی پہچان لیا۔ وہ دروازہ کھول کر بولی۔

"تم کیپٹن سرتاج حسین کی شریک حیات ہو۔ اندر آجاؤ"

بانو نے گاڑی کے اندر آکر دروازے کو بند کیا۔ پھر ان کے پاس بیٹھتی ہوئی بولی۔

"میرا نام بانو ہے۔ شاید میں اپنے بچے کی دو ماؤں سے مل رہی ہوں"

میریا نے اس سے بھی کہا کہ وہ اپنا بچہ نہیں۔ ہمارا بچہ کہے بانو نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"جو بچہ ازل سے میری کوکھ میں لکھ دیا گیا ہے میں اسے آخری سانس تک اپنا کہوں گی۔ تم دونوں بھی اسے اپنا کہو گی تو میں اعتراض نہیں کر سکوں گی۔ سیدھی سی بات ہے وہ اپنا نہ

ہوتا اور اپنائیت نہ ہوتی تو ہم تینوں یہاں نہ آتیں۔"

یشو رانی نے کہا۔ "تم ٹھیک کہتی ہو۔ اُسے اپنا کہتے وقت اعتماد پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنا ہی ہے مگر اس طرح ہمارے درمیان جھگڑا پیدا ہوگا۔"

"ہاں، سمجھوتے کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا ہے۔"

"بچہ ممتا کے بازار میں تین ماؤں کے درمیان نیلام بھی نہیں ہوسکتا۔"

"اس کے لئے لاٹری کی پرچی بھی نہیں اُٹھائی جاسکتی۔"

"حضرت سلیمانؑ کے دربار میں دو عورتوں نے ایک بچے کا دعویٰ کیا تھا۔ وہاں اصل ماں کے ساتھ انصاف ہوگیا تھا مگر ہم تین ماؤں کا فیصلہ کسی دربار میں نہیں ہوسکتا۔"

میریا نے کہا۔ "خود غرضی کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی اپنی حسن جیتوں اور طاقتوں کے بل پر اُسے حاصل کریں۔ میرے پاس قلم کی طاقت ہے میں اپنے بچے کو حاصل کرنے کے لئے دیس کے سارے اخبارات کو جھنجھوڑ ڈالوں گی۔"

یشو رانی نے کہا۔ "میں ایک فلم میں کام کرنے کا معاوضہ چالیس لاکھ روپے لیتی ہوں اس وقت میرے پاس سات کروڑ کا بینک بیلنس اور دو کروڑ کی جائداد ہے میں اپنے بچے کے لئے آٹھ کروڑ روپے داؤ پر لگا دوں گی اور سب جانتے ہیں کہ روپے سے بڑی کوئی طاقت نہیں ہے۔"

بانو نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر یقین مستحکم سے کہا۔

"میرے پاس بھی بہت بڑی طاقت ہے اور وہ ہے خدا ......"

*

رات پہاڑ بن گئی تھی۔ ان تینوں کی آنکھوں سے نیند اُڑ چکی تھی۔ پتہ نہیں وہ بچہ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر آسمان کے پالنے میں سو رہا تھا یا جاگ رہا تھا۔ زندہ تھا یا مر چکا تھا۔ اسی تشویش میں ماؤں کی نیند مر گئی تھی۔

میریا نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ہم سب پڑھی لکھی سمجھدار عورتیں ہیں ہمیں جاہلوں کے انداز میں ایک دوسرے کو چیلنج نہیں کرنا چاہئے اگر ہم سہولت سے پُرسکون ہوکر سوچیں تو شاید کوئی حل نکل آئے۔"

بانو نے کہا۔ "میرے خیال سے ہم تینوں اپنی اپنی داستان سنائیں اس طرح ہم ایک دوسرے کے دکھ درد کو اچھی طرح سمجھ سکیں گے۔ جب ہمارا دکھ مشترک ہوگا تو ہم مشترکہ محبت کے جذبے سے کوئی دانش مندانہ فیصلہ کرسکیں گے۔"

وہ راضی ہوگئیں۔ پھر ایک ایک کرکے باری باری اپنی داستان سنانے لگیں پہلے میریا نے اپنی کتاب زندگی کھولی۔ اس نے اعتراف کیا کہ وہ جذبات کی رو میں بہہ کر جوانی کی ایک علم کی غلطی کر بیٹھی تھی اس کی داستان عام سی تھی مگر وہ اپنی ذات میں خاص درجہ رکھتی ہے وہ بحالت مجبوری بچے کو جدا تو کرسکتی ہے لیکن اس کی محبت کو دل سے نوچ کر نہیں پھینک سکتی اس نے داستان کے آخر میں کہا۔

"میں یہ برداشت نہیں کرسکتی کہ دنیا والے میرے بچے کو ناجائز کہیں۔ اور میں اپنا کیریر بھی تباہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے میں نے بچے کو آشرم میں چھوڑ دیا ......"

یشو رانی نے اپنی داستان کے آخر میں کہا۔

"فلم کی ہیروئن کوئی اتنی نیک نام بھی نہیں ہوتی۔ میں بدنامیاں اٹھا کر بچے کو ضرور پالتی۔ مگر پھانسی پانے کے خیال سے میں اپنے بچے کو آشرم جیسی محفوظ جگہ چھوڑنے پر مجبور ہوگئی۔"

بانو نے اپنی داستان حیات سنانے کے بعد کہا۔

"نہ مجھے بدنامی کا ڈر تھا اور نہ ہی کوئی میرے بچے پر انگلی اٹھا سکتا تھا۔ میں آخر وقت تک اپنی ماں سے لڑتی اور ضد کرتی رہی کہ بچہ میری گود میں پرورش پائے گا لیکن مذہب اور معصوم کی آڑ لے کر خون کی ہولی کھیلنے والے درندوں نے میرے دل میں دہشت بٹھا دی کہ بچہ کسی محفوظ مقام پر نہ پہنچایا گیا تو ظالم اسے نیزوں پر اچھالیں گے ......"

دو۔ تم بھی کبھی بانو کے ہاں جا کر ایک ماں کی حسرتیں پوری کر سکتی ہو۔ اگر تم دونوں نے میرے اس فیصلے سے انکار کیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ بچے کی عزت تمہیں پیاری نہیں ہے.....“

یہ کہہ کر پنڈت جی باہر چلے گئے میرا اور یشودا تھوڑی دیر تک سر جھکائے بیٹھی رہیں۔ جب بانو ان کے قریب گئی تو وہ دونوں بانو کے سینے سے لگ کر رونے لگیں ان کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو ایک معصوم بچے کی بدنامی کو ہمیشہ کے لئے دھو رہے تھے۔

بابر داس دیو نے پنڈت جی کو دیکھ کر کہا۔

”پنڈت جی! میں سب سمجھتا ہوں کہ اس گاڑی کے اندر کیا کھچڑی پک رہی ہے۔ سچی خبر میرے اخبار میں آکر رہے گی۔

”پنڈت گردھاری لال نے قریب آ کر آہستگی سے کہا۔

”میرے بچے صحافی بیٹے! ایک مسلمان عورت نے ہندو غنڈوں سے اپنے بچے کو محفوظ رکھنے کیلئے اسے آشرم میں چھوڑ دیا تھا۔ کیا یہ سچی خبر تم اپنے دیس کے کسی اخبار میں شائع کر سکو گے؟“

داس دیو کا لٹکا ہوا منہ بتا رہا تھا کہ ایسی سچی خبروں کو اخباری زبان میں پروپیگنڈا کہتے ہیں۔